(الصلوٰۃ)

(نماز کی افادیت واہمیت)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۲	اسرار کلام الٰہی	۱۰
۳	اقسام کلامِ الٰہی	۱۲
۴	قوت استنباطیہ	۱۲
۵	قلبی توجہ کی ضرورت	۱۴
۶	آج کل کے مجتہد	۱۶
۷	قرآن نہ پڑھنے کا بہانہ	۱۷
۸	ترجمہ پڑھنے کا اصول	۱۸
۹	تلاوت کے فوائد	۲۰
۱۰	اہل علم میں ایک کمی	۲۱
۱۱	دنیا وآخرت کی مثال	۲۲
۱۲	توکل کی صورت	۲۳

۱۳	توکل اور کار عقبیٰ	۲۵
۱۴	قلب و اعمال کا تعلق	۲۷
۱۵	ریاضت نفس	۲۹
۱۶	اصلاح ظاہر و باطن	۳۱
۱۷	درستی جوارح و قلب	۳۲
۱۸	برائیوں سے بچنے کا طریق	۳۴
۱۹	اہل علم کی نازک حالت	۳۵
۲۰	نفس کی شرارت	۳۶
۲۱	طلب صادق کا اثر	۳۸
۲۲	وسوسہ اور اس کا علاج	۳۹
۲۳	ذکر و فکر	۴۱
۲۴	فضیلت نماز	۴۲
۲۵	نماز میں روزہ	۴۳
۲۶	کلام الناس سے فساد نماز	۴۴
۲۷	نماز میں ہنسنا اور رونا	۴۵

۲۸	حقیقت کمال	۴۶
۲۹	رونے کی اہمیت	۴۸
۳۰	نماز میں چلنا	۵۰
۳۱	نماز کا توڑنا	۵۲
۳۳	جذبات طبیعہ کی رعایت	۵۳
۳۴	عقل اور شریعت	۵۵
۳۵	شریعت اور راحت	۵۶
۳۶	نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا	۵۷
۳۷	آج کل کی آزادی	۵۹
۳۸	خشوع کی حقیقت	۵۹
۳۹	دفع وساوس کے طریق	۶۰
۴۰	سجدہ کی حقیقت	۶۴
۴۱	خلوت بالمحبوب	۶۵
۴۲	نماز میں حج	۶۷
۴۳	نماز کی جامعیت	۶۸

۲۴	نماز کا وقفہ	۷۰
۲۵	نماز کی صورت	۷۳
۲۶	نماز کی روح	۷۵
۲۷	قرب خداوندی	۷۷
۲۸	اللہ کی محبت	۷۸
۲۹	عتاب میں عنایت	۷۸
۳۰	حق تعالیٰ کی رحمت	۷۹
	ذکر کی خاصیت	۸۲
	صبر کا طریقہ	۸۵
	موت کی پریشانی	۸۷
	نماز کی برکت	۸۹

t

وعظ

(الصلوٰۃ)

(نماز کی افادیت واہمیت)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے وعظ ''الصلوٰۃ'' ۱۱/۴ رجب ۱۳۳۷ھ کو مسجد شاہ پیر محمد صاحب متصل گومتی ندی واقع لکھنوانڈیا میں تخت پر کھڑے ہوکر ارشاد فرمایا جو پونے چار گھنٹے میں ختم ہوا تعداد سامعین تقریبا دو ہزار تھی محمد یوسف صاحب بجنوری ولد مردان علی صاحب نے قلم بند فرمایا۔

موضوع تھا نماز کی اہمیت وافادیت لوگوں کو نماز کی پابندی کرانے کے لئے ایک انجمن بنائی گئی تھی اسی کی مناسبت سے حضرت تھانوی m نے نماز کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ نماز جامع العبادات ہے اس میں ہر عبادات کسی نہ کسی صورت میں پائی جاتی ہے نماز اللہ سے ہم کلامی کا نام ہے اس کو انتہائی اہتمام سے پڑھنا چاہئے۔ نماز میں آنے والے وساوس سے بچنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو اس وعظ سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے اور نماز کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے۔ آمین۔

خلیل احمد تھانوی

۲۱/ستمبر ۲۰۱۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارک وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰی○ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی﴾(۱)

T

یہ دو آیتیں ہیں جو اس کے قبل پرسوں کے بیان میں پڑھی گئی تھیں۔ چونکہ وہ مضمون ناتمام(۲) رہ گیا تھا اس لئے اس کا تتمہ(۳) اس وقت بیان ہوتا ہے اور اتفاق وقت سے وہ اس انجمن کے مناسب بھی ہے میں نے اس وقت دو آیتیں تلاوت کیں ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰی﴾ دوسری ﴿وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی﴾ پہلی آیت کے متعلق پرسوں بیان ہوا تھا۔ دوسری آیت کا بیان رہ گیا تھا۔ وہ اس وقت عرض کیا جائے گا۔

اس دوسری آیت میں حق تعالیٰ نے آیت کے ختم پر فصلّٰی فرمایا جس کے معنی ہیں نماز پڑھی۔ اس کے ترجمہ ہی سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ اس میں نماز کی

(۱) سورۃ الاعلیٰ: ۱۴، ۱۵ (۲) نامکمل (۳) اسوقت اس کی تکمیل کی جاتی ہے۔

فضیلت مذکور ہے اور اس انجمن کی بھی یہی غرض ہے۔ چنانچہ مولانا کے بیان (لکھنو میں ایک انجمن ہے جس کے بہت سے مقاصد ہیں ان میں سے اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ بذریعہ واعظین کے لوگوں کو نماز کی تحریک کیجائے اور انجمن کی جانب سے ناواقفوں کو نماز سکھانے کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ حضرت والا کے وعظ شروع کرنے سے پیشتر انجمن کے اراکین میں سے ایک مولوی صاحب کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے انجمن کی بعض کاروائیاں لوگوں کو سنائی تھیں اور انجمن کا اعلیٰ مقصد نماز کی تعلیم اور اس کا اہتمام ہونا ظاہر کیا تھا۔ حضرت والا نے بھی حسب موقع پر نماز ہی کے متعلق بیان فرمایا۔ حضرت کی تقریر میں مولانا کے لفظ سے وہی صاحب مراد ہیں جنہوں نے انجمن کی کاروائی سنائی تھی۔ غالباً یہ وعظ بھی انجمن ہی کی تحریک سے ہوا تھا۔ گو کہ اہل انجمن نے حضرت والا سے خاص اسی بیان کے لئے نہ کہا تھا لیکن حضرت والا نے خود ہی حسب موقع اس بیان کو اختیار فرمایا تھا۔۱۲ جامع) سے معلوم ہوگیا ہوگا۔ پس یہ مضمون موقع کے مناسب ہوگا۔

اسرار کلام الٰہی

ظاہراً یہ دونوں آیتیں مختصر ہیں مگر کلام اللہ ہونے کی وجہ سے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ آیتیں جامعیت میں تام ہوں گی۔ ان کے اندر کسی قسم کی کمی نہیں ہوسکتی۔ اس وجہ سے الفاظ کے اختصار پر نظر نہ کی جائے بلکہ اس کی حقیقت میں غور کیا جائے اور یہ حق تعالیٰ کے کلام کی خصوصیت ہے کہ نہایت مختصر الفاظ میں بڑے بڑے مہمات (۱) پر تنبہ کردیا ہے۔ پھر کمال یہ کہ وہ اختصار مطلب سمجھنے میں مخل نہیں ہوتا۔ گو حق تعالیٰ کے کلام میں بعض کلمات ایسے بھی ہیں جن کی مراد ہم کو معلوم نہیں (۲)

(۱) مختصر الفاظ میں بہت اہم مسائل بیان کردیئے (۲) یعنی حروفِ مقطعات جیسے الٓمٓ۔

مگر ایسے کلمات صرف وہی ہیں جن کے متعلق عام افادہ (۱) نہیں ہے اور نہ ان کے اندر احکام کا بیان ہے بلکہ ان میں خاص خاص اسرار ہیں جو حضور کو منکشف (۲) کر دیئے گئے ہیں اور بعض کے نزدیک وہ کنوز مخفیہ (۳) میں سے ہیں کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی جمہور کے نزدیک ان کا انکشاف (۴) نہیں ہوا لیکن چونکہ عام افادہ انکے متعلق نہیں ہے اس لئے ان کے مخفی رہنے میں کوئی قباحت (۵) بھی نہیں۔ غرض کہ کلام اللہ میں اس قسم کے کلمات بھی موجود ہیں اور اس کے اندر بعض مضامین ایسے بھی ہیں کہ وہ بالکل تو مخفی نہیں ہیں مگر ہیں غامض (۶) کہ ہر شخص کا فہم ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ ان کی توضیح حضرات مجتہدین نے کر دی۔ ہاں جو باتیں محض عقائد یا ترغیب وترہیب کے متعلق ہیں وہ بہت ہی سہل ہیں (۷)۔ ان میں کوئی غموض نہیں۔ کسی کو ان کے سمجھنے میں دقت واقع نہیں ہوتی۔ کلام اللہ ان تمام اقسام پر مشتمل ہے۔

اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ حق تعالیٰ تو قرآن کی نسبت یہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کو آسان کر دیا ہے پھر اس کے اندر امور مخفیہ وغامضہ (۸) کیسے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ آسان کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر حصہ سہل ہو۔ جو جزو سہل ہے اس کو خود بیان فرما دیا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ﴾ کہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کر دیا ہے۔ للذکر کو جو بڑھایا تو اسی وجہ سے کہ یہ صرف نصیحت حاصل کرنے کے اعتبار سے سہل (۹) ہے۔ اگر مطلقاً سہل ہوتا (۱۰) تو صرف ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ﴾

(۱) عام فائدے (۲) حضور پر کھول دیئے گئے (۳) پوشیدہ خزانہ میں سے ہے (۴) اللہ کے علاوہ ان کے معنی کوئی نہیں جانتا (۵) عام لوگوں کے لئے اس میں کچھ فائدہ نہیں ہے اس لئے ان کے معنی کو پوشیدہ رکھنے میں کوئی برائی نہیں ہے (۶) مشکل ہیں کہ ہر شخص نہیں سمجھ سکتا (۷) آسان ہیں (۸) اس میں پوشیدہ اور ناقابل فہم مسائل کیسے بیان ہو سکتے ہیں (۹) آسان ہے (۱۰) اگر سب ہی آسان ہوتا تو۔

فرماتے ﴿لِلذِّكْرِ﴾ کی قید نہ بڑھاتے۔

اقسام کلامِ الٰہی

خوب سمجھ لیجئے کہ کلام اللہ میں دو قسم کے مضمون ہیں۔ ایک تو مضمون ہے تذکیر کا۔ قرآن کے جتنے حصہ میں یہ مضمون ہے وہ تو نہایت آسان ہے کسی کو بھی اس کے سمجھنے میں دقت نہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ﴾ ''اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کر دیا ہے'' اس بات کو صاف طور پر بتلایا جارہا ہے کہ وہ حصہ قرآن کا اتنا سہل کیا گیا ہے کہ ہر شخص اس سے واقفیت حاصل کرسکتا ہے اور واقعی وہ حصہ ہے بھی ایسا ہی کہ کسی کو بھی اس کے سمجھنے میں کسی قسم کی دقت نہیں ہوتی مثلاً قیامت کا ہونا، عذاب، ثواب کا پایا جانا، جنت ودوزخ کا موجود ہونا۔ اسی طرح اور عقائد ہیں کہ ان کو ایسی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے بتلائیے کہ ان امور کے سمجھنے میں کسی کو کیا دقت ہے اور انہی کا سمجھانا منکر کو دلائل عقلیہ (۱) سے ضروری بھی ہے۔

رہے باقی احکام ان کا ایسے دلائل سے سمجھانا ضروری نہیں ہے۔ اسی وجہ سے دین کے دو جزو قرار دیئے جاتے ہیں۔ ایک اصول ایک فروع۔ اصول تو وہی ہیں جن کا سمجھا دینا ضروری ہے۔ پس وہ ایسے سہل کئے جائیں کہ کسی کو بھی ان کے سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ فروع جن کا دلائل سے سمجھانا ضروری نہیں۔ ایک تو قرآن میں یہ مضمون ہے اور دوسرا مضمون ہے احکام غامضہ (۲) کا جس میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔

قوت استنباطیہ

ہر شخص کا فہم اس کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے خاص فہم کی حاجت ہے (۳)

(۱) جنت دوزخ قیامت وغیرہ کے منکر کو ان کے وجود کو عقلی دلائل سے سمجھنا ضروری ہے (۲) مشکل احکام (۳) خاص سمجھ داری کی ضرورت ہے۔

قرآن کے جتنے حصوں میں یہ مضمون ہے وہ مشکل ہے اور احکام غامضہ کا سمجھنا اور ان میں استنباط کرنا(۱) تو کیسے مشکل نہ ہوتا جبکہ معمولی خبروں تک کا سمجھنا دشوار ہے۔

چنانچہ کلام اللہ میں حق تعالیٰ نے منافقین کی شکایت فرمائی ہے اس بناء پر کہ وہ لوگ امن وخوف کی خبریں سن کر مشہور کردیتے تھے اور رسول اور اولی الامر(۲) کے حوالے ان کو نہیں کرتے تھے چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ط وَلَوْرَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾(۳) ''کہ جب ان کے پاس کوئی خبر امن کی یا ڈر کی پہنچتی ہے تو اس کو مشہور کردیتے ہیں اور اگر اس کو رسول اللہ ﷺ اور اپنے اہل حکومت کے حوالے کرتے تو اہل تحقیق ان میں سے اس کی تحقیق کرلیتے'' (کہ یہ خبر قابل اشاعت ہے یا نہیں)

سو منافقین کی یہ کیفیت تھی کہ جیسی خبر ان کو پہنچتی مشہور کردیتے۔ یہ نہ خیال کرتے کہ کون سی خبر عوام میں شائع کرنے کے قابل ہے اور کونسی نہیں۔ سب خبروں کو یکساں شائع کردیتے ہیں حق تعالیٰ اس بات پر ان کی اس آیت میں شکایت فرماتے ہیں۔ ﴿وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ط﴾ ''جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچتی ہے اس کو مشہور کردیتے ہیں'' آگے ان کو مشورہ دیتے ہیں۔ ﴿وَلَوْرَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ کہ ان کو یوں چاہیے تھا کہ رسول اللہ ﷺ اور اولی الامر یعنی جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ہے اور وہ صاحب اختیار اور تجربہ کار ہیں ان کے حوالے کردیتے۔ پس جن میں قوت استنباطیہ ہے وہ ان

(۲) مشکل احکام کو سمجھنا اور آیات سے ان کے حکم کو ظاہر کرنا کیوں نہ مشکل ہوگا (۲) سورۂ نساء: (۴) مشکل احکام۔

خبروں میں استنباط کرتے کہ آیا یہ قابل اشاعت ہیں یا نہیں اور پھر یہ منافقین ان کی رائے کے موافق عمل کرتے۔

پس جب معمولی خبروں میں قوت استنباطیہ کی ضرورت ہے اور ہر شخص اس کا اہل نہیں بلکہ اہل استنباط کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے تو جو احکام غامض اور دقیق ہیں(۱)۔ ان میں کیسے ہوسکتا ہے کہ ہر شخص ان کو سمجھ لے اور اہل استنباط(۲) کی طرف رجوع کرنے کی اس کو ضرورت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ احکام کے سمجھنے اور ان کے اندر استنباط کرنے کو عام طور سے جائز نہیں قرار دیا گیا کہ ہر شخص اس کو کرے۔ پس یہ حصہ قرآن شریف کا غامض ہے(۳) اور دوسرا جو تذکیر کا حصہ ہے(۴) جس میں ترغیب ترہیب(۵) اور عقائد کا بیان ہے اس میں کچھ خفاء نہیں ہر شخص اس کو سمجھ سکتا ہے۔

قلبی توجہ کی ضرورت

اسی طرح احکام بھی درجہ اجمال میں آسان ہیں۔ لیکن درجہ تفصیل میں دشوار ہیں۔ دیکھئے ایک تو کلام اللہ میں یہ ہے کہ نماز پڑھو۔ اس کے سمجھنے میں تو کچھ اخفاء نہیں(۶)۔ یہ تو اجمالی درجہ ہے اور ایک نماز کی تفصیل ہے کہ لاحق(۷) کے کیا احکام ہیں مسبوق(۸) کا کیا حکم ہے علیٰ ہذا۔ تو اس میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔ اس کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس کے سمجھنے کے لئے خاص فہم کی حاجت ہے۔ یہ

(۱) جو احکام مشکل اور قابل تحقیق ہیں (۲) جن لوگوں میں آیات سے احکامات اخذ کرنے کی صلاحیت موجود ہے (۳) مشکل ہے (۴) جو حصہ قرآن نصیحت پر مبنی ہے (۵) جن میں عذاب سے ڈرایا گیا یا ثواب کی خوشخبری دی یا عقائد بیان کئے وہ آسان ہے (۶) کوئی پوشیدگی نہیں (۷) لاحق وہ شخص ہے جس کو دوران نماز کوئی ایسا عذر پیش آیا ہو جس سے نماز ٹوٹ گئی اور پھر وضو کر کے وہ نماز میں شریک ہوا ہو جس کے سبب امام کی کچھ نماز میں وہ امام کے ساتھ شریک نہ رہا ہو۔ اس کا کیا حکم ہے (۸) مسبوق وہ شخص کہلاتا ہے جس کی ایک رکعت نکل گئی پھر وہ امام کے ساتھ نماز میں شریک ہوا تو اس کا کیا حکم ہے۔

تو معلوم ہوگیا کہ قرآن شریف میں ذکر کا حصہ نہایت آسان ہے مگر اس کے نافع ہونے کے لئے ایک چیز کی اور ضرورت ہے۔ وہ کیا ہے، توجہ۔ جب تک توجہ نہ ہو اس وقت تک اس کا کوئی نفع نہیں ہوسکتا گو وہ کتنا ہی آسان ہو اگر کوئی شخص بغیر توجہ کے ان آیات کا ترجمہ دیکھے تو وہ کچھ بھی نہ سمجھے گا بلکہ توجہ کے بغیر تو اپنی بول چال بھی نہیں سمجھتے۔

مثلاً بازار جایئے وہاں صدہا حکایات(۱) کان میں پڑتی ہیں جب لوٹ کر آتے ہیں تو خبر بھی نہیں رہتی کہ کیا سنا تھا۔ حتی کہ وہ حکایات سوچنے سے بھی یاد نہیں آتیں۔ وجہ یہی ہے کہ ادھر توجہ نہیں۔

اس لئے اگر کوئی ترجمہ جانتا ہو مگر التفات نہ ہو تو قرآن شریف کے حصہ ذکر سے بھی پورا نفع حاصل نہیں کرسکتا۔ اس لئے حق تعالیٰ کسی جگہ تو ارشاد فرماتے ہیں۔ ''لیدبروا ایاتہ'' کہ اس کی آیات میں تدبیر کریں۔ اور کسی جگہ فرماتے ہیں ''لیتذکر اولوا الالباب'' کہ عقل والے نصیحت حاصل کریں۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ باوجود آسان ہونے کے تدبیر(۲) کی حاجت ہے۔ اس کا نفع بدوں(۳) اس کے پورا حاصل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ میں نے اس مثال سے واضح کردیا۔ قرآن شریف کے اندر ایک موقع پر اسی کو تصریحاً فرمایا ہے۔ وہ ہے: ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ﴾ ''کہ اس میں نصیحت ہے اس شخص کے لئے جو (فہیم) دل رکھتا ہے یا (اگر زیادہ فہم نہ ہو) تو متوجہ ہوکر کان (ہی) لگادیتا ہو۔ یہ آیت بتلا رہی ہے کہ یہ نفع کا موقوف علیہ ہے کہ قلب فہیم سے کام لے(۴) یا متوجہ ہوکر سنے کہ بدوں اس کے نفع نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہوگیا کہ قرآن کا وہ حصہ مشکل ہے جس میں ان احکام کا بیان ہے جن کے اندر اجتہاد کی ضرورت ہے۔

(۱) سینکڑوں باتیں (۲) غور وفکر (۳) اسکا فائدہ بغیر اس کے (۴) نفع اسی وقت ہوتا ہے جبکہ سمجھداری سے کام لیا جائے۔

آج کل کے مجتہد

بعض مدعی اجتہاد اس زمانہ میں ایسے ہیں کہ صرف ترجمہ دیکھ کر اجتہاد کرتے ہیں اجتہاد کیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تحریف کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے سنا ہے کہ ایک شخص نے یہ رائے دی تھی کہ اب وضو کی ضرورت نہیں۔ اس وجہ سے کہ وضو سے مقصود تطہیر اعضا ہے(۱) اور ہم لوگ اس زمانہ میں ویسے ہی صاف ستھرے رہتے ہیں۔ اس لئے اب کیا ضرورت ہے وضو کی۔ پہلے زمانہ میں گرد وغبار پڑتا رہتا تھا۔ میلے کچیلے رہتے تھے اس لئے وضو کی ضرورت تھی۔ اب ہم آئینوں کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ گرد وغبار پاس کو بھی نہیں آتا۔ تو اب وضو کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ان صاحب نے اجتہاد کیا۔ یا تو اس قدر اجتہاد کا زعم اور یا اس طرف التفات بھی نہیں۔

چنانچہ مولوی محمد حسین صاحب m ایک بیرسٹر کا قصہ سناتے تھے کہ اس نے ان سے یہ کہا کہ علماء کو چاہیے کہ جمع ہو کر سود کی حلت کا فتویٰ دے دیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ علماء کے گھر کی بات تھوڑا ہی ہے کہ جیسے چاہیں پھیر لیں۔ سود کی حرمت تو کلام اللہ میں منصوص ہے۔ کلام اللہ کے خلاف کون جرأت کرسکتا ہے اس پر آپ حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا سود کی حرمت قرآن شریف میں ہے ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ مولویوں کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔

دیکھئے یہ حال ہے ان لوگوں کی اجنبیت کا قرآن سے کہ اعلیٰ درجہ کی لیاقت کے بیرسٹر تھے اور مولوی بھی کہلاتے تھے مگر اتنی خبر نہ تھی کہ یہ قرآن کا مسئلہ ہے لیکن چونکہ مسلمان تھے اس وجہ سے معلوم ہونے کے بعد اپنے منہ پر طمانچے

(۱) اعضاء کو پاک کرنا۔

مارے اور بہت نادم ہوئے (۱)۔ سو آج کل کے عقلاء دعویٰ تو اجتہاد کا کرتے ہیں مگر ان کی اجنبیت کا قرآن سے یہ حال ہے۔

ایک اور قصہ ہے کسی معقولی کا کہ ان سے ایک دفعہ لوگوں نے کہا کہ کچھ بیان کیجئے۔ آپ نے نماز کا بیان شروع کیا۔ کچھ یاد تھا نہیں۔ بہت سوچ کر آپ نے فرمایا کہ آج کل لوگوں کا کیا حال ہوگیا ہے کہ نماز نہیں پڑھتے حالانکہ قرآن شریف میں ہے (من ترك الصلوٰة متعمداً فقد كفر) اس پر کسی نے ان حضرت کو ملامت کی کہ آپ نے اسے (یعنی حدیث شریف کو) قرآن شریف میں کیسے بتلادیا۔ تو آپ تعجب سے فرماتے ہیں کہ کیا یہ قرآن کی آیت نہیں ہے۔

یہ حالت رہ گئی ہے اس زمانہ میں۔ یہ بھی خبر نہیں کہ یہ قرآن کی آیت ہے یا حدیث ہے۔ اس حالت پر اندیشہ ہے کہ قیامت کو رسول اللہ ﷺ یوں نہ فرمانے لگیں: ﴿یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا﴾ ''کہ اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو ترک کردیا تھا''۔

قرآن نہ پڑھنے کا بہانہ

معنی سے تو غفلت تھی ہی وہ جو سہل چیز ہے (یعنی الفاظ قرآن) اس سے بھی غفلت ہوتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ آج کل کے بہت سے عقلا کی رائے ہے کہ قرآن شریف کا پڑھنا ہی فضول ہے۔ رام پور کا قصہ ہے ایک صاحب کا بچہ قرآن پڑھتا تھا۔ ان کے ایک دوست نے جو انگیریز کے بہت حامی تھے کہا کہ آپ اس لڑکے کو انگریزی پڑھایئے۔ ان کے دوست نے اس پر انکار نہیں کیا بلکہ یوں کہا کہ یہ قرآن پڑھ رہا ہے۔ وہ ختم ہوجاوے تو انگریزی شروع کراوں۔ وہ پوچھتے

(۱) شرمندہ ہوئے۔

ہیں کہ آدھا کتنے دنوں میں پڑھا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ دو برس میں۔ تو آپ کہتے ہیں کہ دو برس تو ضائع کر ہی چکے۔ اب اور دو برس کیوں ضائع کرتے ہو۔

ان عقلاء نے کلام اللہ نہ پڑھانے کا ایک بہانہ نکالا ہے کہ کہتے ہیں، اجی صاحب بدوں مطلب سمجھے ہوئے پڑھنے سے کیا فائدہ۔ اگر پڑھا جاوے تو معنی مطلب کے ساتھ پڑھا جاوے۔ صرف الفاظ رٹنے سے کیا نتیجہ۔ اپنے نزدیک بڑی خیر خواہی کی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ صرف نہ پڑھانے کا بہانہ ہے۔ مقصود تو ہے نہ پڑھانا اور اس کا بہانہ یہ تلاش کیا۔ اگر بہانہ نہیں تو ترجمے تو شائع ہو گئے ہیں پھر ترجمہ سمیت کیوں نہیں پڑھاتے۔ ہاں اس وقت بہانہ نہ سمجھا جاتا جب کہ یہ لوگ ویسے تو نہ پڑھاتے مگر ترجمہ کے ساتھ پڑھاتے ہیں لیکن دیکھا جاتا ہے کہ یہ حضرات نہ ویسے پڑھاتے ہیں نہ ترجمہ سے پڑھاتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بس نہ پڑھانا ہی مقصود ہے۔ اور یہ صرف بہانہ ہے نہ پڑھانے کا۔

ترجمہ پڑھنے کا اصول

ہاں ترجمہ کی نسبت میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر ترجمہ پڑھایا جاوے تو خود مطالعہ کرنے کی اجازت نہ دی جاوے بلکہ کسی واقف کار سے سبقاً سبقاً پڑھا جاوے اور جو مضامین دقیق ہوں[1] ان کے اجمال پر اکتفا کیا جاوے۔ معلم بھی ان کی تفصیل نہ بیان کریں بلکہ اجمال کے ساتھ ان کا مطلب بیان کر دیں۔ تفصیل کی کاوش نہ کریں۔ جتنی بات سمجھ میں آسکتی ہے اس کے بتلانے پر اکتفا کریں ورنہ اقلیدس وغیرہ علوم کی کتابیں بھی بغیر استاد کے پڑھیں اور خود مطالعہ کر کے امتحان دے دیا کرو۔ استاد سے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر کہا جاوے کہ قلیدس پیچیدہ ہے۔ اس لئے استاد سے پڑھنے کی ضرورت ہے اور قرآن شریف

(۱) جو مضامین مشکل ہوں۔

ایسا نہیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ قانون بھی تو ایسا پیچیدہ نہیں ہے۔ قانون ہی کی کتاب لیجئے اور خود اس کا مطالعہ کیجئے ضرور آپ اس کے سمجھنے میں غلطی کریں گے اور جو استاد سے پڑھے ہوں وہ غلطی نہ کریں گے۔ قانون دان ہی جانتا ہے قانون کی باتوں کو۔ قانونی کتاب کی ایک خاصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک امر کے متعلق ایک جگہ اجمالی حکم ہوتا ہے دوسری جگہ اس کی تفصیل ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن شریف میں بھی ایسا واقع ہوا ہے کہ ایک حکم کو دو مقام سے تعلق ہے۔ ایک موقع میں تو اس کو اجمالاً بیان کیا ہے اور دوسری جگہ اس کی تفصیل کر دی ہے جب تک تفصیل کے موقع کو سمجھے ہوئے نہ ہوگا تو یہاں کیا سمجھے گا اور کہیں ایسا ہے کہ کچھ تفصیل اس موقع پر ہے اور کچھ دوسرے موقع پر۔ پس اس کے سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ دونوں موقعوں کا علم ہو اور یہ بات واقف کار ہی جان سکتا ہے کہ اس کا ذکر کتنی جگہ ہوا ہے۔ خود مطالعہ کرنے والا کیا جانے گا۔ بس یہ ہوگا کہ ایک موقع پر مجمل دیکھ کر اس کو الجھن پیدا ہوگی اور شکوک واقع ہوں گے۔ اور یہ کچھ کلام اللہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہر فن میں یہی ہے۔

مثلاً فقہ ہی ہے۔ اس میں ایک مسئلہ ہے جس کا تعلق دو باب سے ہے۔ ایک باب میں مجمل ہے اور ایک باب میں مفصل ہے۔ تو جب تک دونوں موقعوں سے واقفیت نہ ہوگی تو کیا خود سمجھ سکے گا اور کیا دوسروں کو سمجھا سکے گا۔

ایک شافعی المذہب نے مجھ سے فقہ شافعی پڑھنا چاہا تو میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے فقہ شافعی پڑھا ہی نہیں۔ شاید کوئی موقع ایسا ہو کہ ایک مسئلہ کا تعلق دو جگہ سے ہو اور ایک موقع پر اجمال ہو اور دوسری جگہ اس کی تفصیل ہو اور میں اس تفصیل سے واقف ہوں نہیں۔ پس میں غلطی کر بیٹھوں۔ اس لئے میں نے صاف کہہ دیا کہ آپ شافعی المذہب سے پڑھئے۔ پس یہ وجوہات ہیں جن کی

وجہ سے میں کہتا ہوں کہ قرآن شریف کا ترجمہ خود دیکھ لینا کافی نہیں ہے۔ کسی محقق عالم سے پڑھ لینا چاہیے۔ لیکن اس کے لئے اگر فرصت نہ ہو تو یہ تو نہ ہو کہ الفاظ کو بھی بے فائدہ سمجھ کر چھوڑ دیا جائے کیونکہ فائدہ قرآن شریف کا معانی کے ساتھ تو خاص نہیں۔ فائدہ کے اور اقسام بھی ہیں۔ ایک قسم کے انتفاء سے مقسم کا انتفاء تو نہیں ہوتا (مطلب یہ ہے کہ معنی سمجھنے کا فائدہ ہے۔ نرے الفاظ میں اس کے جاتے رہنے سے الفاظ قرآن کا دوسرا فائدہ تو مثلاً ثواب کہیں نہیں جاتا رہا)۔

ہم کو معلوم ہے کہ بعض انگریزی خواں اقلیدس کی عبارت یاد کر کے امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مطلب کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ بتلائیے کہ اس صورت میں اقلیدس کے محض الفاظ یاد کرنے مفید ہوئے یا عبث ہوئے[1]۔ ہر شخص اس کو مفید ہی کہے گا۔

فائدہ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ پاس ہو جائے خواہ مطلب کچھ بھی نہ سمجھے اور یہ نفع صرف الفاظ یاد کرنے سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ قرآن شریف کے ساتھ ہمارا یہ برتاؤ نہیں۔ اس کے الفاظ کا یاد کرنا محض بیکار سمجھتے ہیں۔

تلاوت کے فوائد

اب قرآن شریف کے الفاظ پر جو ثمرہ مرتب ہوتا ہے اس کو بتلاتا ہوں۔ حدیث شریف میں ہے کہ قرآن شریف جب کوئی پڑھتا ہے تو ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو جس نے کٓھٰیٰعٓصٓ ایک مرتبہ کہا تو اس کے نامہ اعمال میں پچاس نیکیاں لکھی گئیں۔ تو کیا یہ فائدہ نہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ لوگ نفع کو منحصر سمجھتے ہیں نفع عاجلہ میں[2]۔ جب اسے نہیں دیکھتے تو کہہ دیتے ہیں کہ اس میں کچھ نفع نہیں۔ حالانکہ نفع اس میں منحصر نہیں۔ ایک اور نفع بھی ہے جس کو نفع آجلہ[3] کہتے ہیں۔

(۱) بیکار (۲) فوری نفع میں (۳) بعد میں ہونے والا فائدہ۔

یعنی آخرت کا نفع جس کو ثواب کہتے ہیں۔ مگر چونکہ نفع عاجلہ مشاہد ہے(۱) کہ وہ آنکھوں سے نظر آتا ہے اس لئے اس کو تو نفع سمجھتے ہیں اور ثواب ملنا مشاہد نہیں اس لئے اس کو تو نفع نہیں خیال کرتے۔

چنانچہ بعض خواص تک کی زبان پر یہ آجاتا ہے جب کہ وہ کسی کو ذکر و شغل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میاں کام کرتے ہوئے تمہیں اتنے دن ہوگئے کچھ نفع بھی ہوا کچھ معلوم بھی ہونے لگا۔ یعنی کچھ نظر بھی آتا ہے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ معلوم تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تو کہتے ہیں کہ بس میاں ثواب اکٹھا کئے جاؤ۔ گویا ان کے نزدیک ثواب ایسی بے قدر چیز ہوئی۔ یہ کس قدر افسوسناک بات ہے۔ سو یہ ثواب نرے الفاظ میں بھی ہے۔ سو کیا ثواب نفع نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو الفاظ قرآن کو پڑھنا فضول سمجھتے ہیں۔

اہل علم میں ایک کمی

اب ایک وہ ہیں جو الفاظ قرآن کو تو پڑھتے ہی ہیں اس کے ساتھ معانی کو بھی پڑھتے ہیں۔ ترجمہ بھی جانتے ہیں اور اہل علم بھی ہیں مگر ان میں ایک اور بات کی کمی ہے۔ وہ یہ کہ تدبیر نہیں کرتے۔ لفظی تحقیق تو بڑی لمبی چوڑی کریں گے۔ مثلاً ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ (بامراد ہوا جو شخص ''خبائث عقاید و اخلاق سے'' پاک ہوگیا) میں قد حرف تحقیق ہے اور افلح ماضی کا صیغہ ہے اور من اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر فاعل ہے۔ یہ ساری لمبی چوڑی تحقیق کرلیں گے مگر حق تعالیٰ کا مقصود اس سے کیا ہے اس کی طرف التفات بھی نہیں۔ قرآن شریف کو اس نظر سے دیکھتے ہی نہیں کہ یہ ہماری اصلاح کا کفیل ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے حکیم محمود خاں سے نسخہ لکھوایا اور اس کو اس

(۱) فوری نفع تو فی الفور نظر آتا ہے۔

نظر سے دیکھنے لگا کہ اس نسخہ کا خط کیسا ہے، دائرے کیسے ہیں۔ اس نظر سے نہیں دیکھا کہ اجزاء کیسے ہیں۔ مزاج کی کیسی رعایت کی ہے۔ صرف یہ دیکھا کہ خوشخط ہے، دائرے خوب بنائے ہیں۔ اور اس پر کہنے لگا کہ محمود خان بڑے طبیب ہیں، ان کے دائرے کیسے عمدہ ہیں اس سے معلوم ہوگا کہ یہ شخص نسخہ کی حقیقت ہی نہیں سمجھا۔ نسخہ کی حقیقت تو یہ ہے کہ مرض کے موافق ہو۔ اس سے اصلاح ہوتی ہو۔ نسخہ کو اس نظر سے دیکھنا چاہیئے۔

اسی طرح اہل علم قرآن کے الفاظ کی تو خوب تحقیق کرتے ہیں مگر اس کا خیال نہیں کرتے کہ حق تعالیٰ کا اس سے مقصود کیا ہے یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے اندر ہمارے امراض باطن کے کیسے علاج کئے گئے ہیں اور ہم کو اس سے نفع حاصل کرنا چاہیے۔

دنیا و آخرت کی مثال

اس وجہ سے میں اس طرف متوجہ کرتا ہوں کہ اس آیت کے اختصار الفاظ کی طرف نظر نہ کرنی چاہیے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ نے اس کے اندر کیا بات بتلائی ہے جس کا مختصر بیان یہ ہے کہ اس موقع پر حق تعالیٰ نے اصلی مطلوب کو بتلایا ہے کہ تمام مطالب اسی کے اندر منحصر ہیں۔ وہ مطلوب کیا ہے فلاح اور فلاح کا طریقہ بھی ارشاد فرمایا ہے۔ افلح میں تو مطلوب کو بتادیا کہ ہر ایک شخص کو فلاح مطلوب ہونی چاہیے اور من تزکیٰ میں طریقہ ارشاد فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ فلاح تو مطلوب ہے اور اس کا طریقہ ہے تزکیہ۔ پس جس کو فلاح کامل میسر ہوگئی تو اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

اب بیان اس کا ہونا چاہیے کہ فلاح کامل کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اور اس کے بیان کی اس لئے ضرورت ہے کہ بعض آدمی ایسی باتیں کیا کرتے ہیں جس سے

معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک فلاح کامل کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ نصیحت کرنے پر کہا کرتے ہیں کہ بس جی جنت میں پہلے تم ہی چلے جانا ہم دوزخ کی سزا بھگتنے کے بعد ہی چلے جائیں گے۔ سو ان کا مطلب کیا ہے کہ فلاح کامل کی ضرورت نہیں۔ اب میں اس کا فیصلہ کہ فلاح کامل کی ضرورت ہے یا نہیں دنیا کے واقعات سے بتلائے دیتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جسے دنیوی امور میں فلاح کامل مقصود نہیں ہے حالانکہ دنیا کوئی چیز نہیں ہے آخرت کے مقابلے میں۔

دنیا دار آخرت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سمندر میں انگلی ڈبوئے۔ سو جیسی اس کو سمندر سے نسبت ہے ایسی ہی دنیا کو آخرت کے ساتھ ہے بلکہ حقیقت میں اتنی نسبت بھی نہیں۔ محض تقریب الی الفہم کی غرض (۱) سے رسول اللہ ﷺ نے یہ مثال دی ہے دنیا کو آخرت سے اس سے بھی زیادہ بعید نسبت ہے۔ کیونکہ دنیا محدود ہے اور آخرت غیر محدود (۲) اور محدود کو غیر محدود سے نسبت ہی کیا ہو سکتی ہے اور اس مثال میں نسبت محدود کی محدود کے ساتھ ہے (انگلی کی تری بھی محدود اور سمندر بھی محدود ہے)۔ سو دو محدود شے کے اندر وہ تفاوت نہیں ہو سکتا جو کہ محدود اور غیر محدود کے اندر ہوتا ہے۔ پس یہ حقیقی مثال نہ ہوئی۔ مگر چونکہ اور کوئی مثال لوگوں کے فہم سے قریب نہ تھی اس لئے اس پر اکتفا فرمایا۔ سو دنیا آخرت کے مقابلہ میں یہ نسبت رکھتی ہے۔

توکل کی صورت

مگر پھر بھی ہم دنیا کے مقاصد میں لوگوں کی حالت دیکھتے ہیں کہ کبھی ان کو ایک حالت پر قناعت نہیں ہوتی جب تک درجہ کمال حاصل نہ کرلیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر چاہتے ہیں۔ چنانچہ رات دن لوگوں کا اس پر عمل ہو رہا ہے۔ پس

(۱) صرف سمجھانے کے لئے آپ ﷺ نے یہ مثال بیان کی (۲) دنیا کی حد مقرر ہے اس کے بعد ختم ہو جائے گی اور آخرت کی کوئی حد نہیں وہ ہمیشہ رہے گی۔

جب دنیا کے مقاصد میں ہمارا یہ برتاؤ ہے باوجود اس کی حقارت کے تو آخرت کے مقاصد میں ہمارا کیا برتاؤ ہونا چاہیے۔ جو آخرت کے ساتھ ہمیں معاملہ کرنا چاہیے تھا وہ معاملہ دنیا کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ دنیا میں تو جو درجہ بھی کمال کا حاصل ہو اس سے اور آگے قدم بڑھانا چاہیں گے اور اخرت کے بارہ میں یہ معاملہ نہیں۔ بس اصل مذاق تو ہر شخص کا یہی ہے کہ جو شے اس کو محبوب ہوتی ہے اس کا اعلیٰ درجہ اس کو مقصود ہوتا ہے اور جو شے مقصود ہوتی ہے اس کی تحصیل میں پوری کوشش کرتا ہے۔ پس جب آخرت کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو پھر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آخرت کی فلاح کامل درجہ (۱) پر مقصود ہے۔ کوئی شخص ایک شے کو حاصل کرنا چاہتا ہو مگر اس کے طرق سے گھبرائے تو اس کو اس شے کا طالب تھوڑا ہی کہیں گے۔

جیسے کوئی شخص کھیتی کرنا چاہے مگر نہ تو بیج ڈالے نہ پانی دے نہ اور شرائط کو پوری کرے بس اللہ کے فضل پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائے تو اس کو کھیتی کا طالب نہیں کہہ سکتے۔ رجا وہ ہے (۲) کہ اسباب جمع کر کے امیدوار رہے۔

اس سے بھی ایک اور موٹی مثال ہے۔ ایک شخص اولاد کا طالب ہے اور چاہتا ہے کہ صاحب اولاد ہو۔ سو ظاہر ہے کہ طریقہ اس کا یہی ہے کہ نکاح کرے اگر بیمار ہو تو علاج بھی کرے اور پھر اولاد کا امیدوار بنے۔ یہ تو ہے رجا اور ایک شخص ہے کہ یہ تو چاہتا ہے کہ اولاد ہو مگر نکاح نہیں کرتا۔ بزرگوں کے پاس جاتا ہے کہ اولاد ہونے کی دعا کر دیجئے۔ وہ جواب یہ دیتے ہیں کہ اول نکاح کرو۔ خدا کرے گا اولاد بھی ہوگی۔ تو وہ کہتا ہے کہ اولاد تو چاہتا ہوں مگر نکاح کا بکھیڑا مجھ سے نہیں کیا جاتا تو اس کو یوں جواب دیا جائے گا کہ عادۃ اللہ اسی طرح جاری ہے کہ اسباب کے جمع کرنے پر ثمرہ (۳) مرتب ہوتا ہے۔ اب وہ نظیر دیتا ہے کہ حوا علیہ السلام ویسے ہی پیدا ہوئی تھی میں بھی چاہتا ہوں کہ اسی طرح اولاد ہو جائے یا کوئی عورت

(۱) آخرت کی کامیابی مکمل طور پر چاہتے ہیں (۲) امید اس کو کہتے ہیں کہ اسباب جمع کرے پھر توکل کرے (۳) نتیجہ۔

تمنا کرے کہ میرے اولاد پیدا ہو اور نکاح نہیں کرتی اور چاہتی ہے کہ بلا نکاح ہی ہوجائے اور کہتی ہے کہ عیسیٰؑ بلاباپ کے پیدا ہوئے تھے۔ پس ضرورت کیا ہے نکاح کی تو ایسے شخصوں کو طالب نہیں کہہ سکتے۔

بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ عادت(۱) مستمرہ کے موافق کام کرتے ہیں اور احیاناً اس کے خلاف بھی قدرت ظاہر کرنے کے لئے دکھادیتے ہیں، اگر وہ کہے حق تعالیٰ قادر تو ہیں کہ بلا نکاح کے اولاد دے دیں۔ تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ بیشک وہ قادر ہیں کہ بلا اسباب کے پیدا کردیں مگر آپ کو انہوں نے اجازت نہیں دی ایسے اسباب کے ترک کرنے کی۔

خلاصہ یہ کہ جو شخص نکاح تو نہ کرے اور اولاد کا خواہشمند ہو وہ اولاد کا طالب نہیں۔ اسی طرح جو شخص فلاح کامل کے اسباب اختیار نہ کرے وہ فلاح کامل کا طالب نہیں اور اس کو توکل کا دعویٰ کرکے اس سے اسباب کو ترک کرنا جائز نہیں۔

توکل اور کار عقلیٰ

جو لوگ توکل توکل کا سبق وردزبان رکھتے ہیں ان صاحبوں نے آخرت ہی کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے۔ دنیوی اسباب جمع کرنے میں توکل نہیں کرتے۔ اس میں تو بڑے چست وچالاک ہیں۔ ان کے جمع کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ باوجودیکہ حق تعالیٰ نے روزی کی ذمہ داری بھی لے لی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾(۲) ''کہ زمین پر کوئی چلنے والا نہیں مگر اللہ پر اس کا رزق ہے'' اور اس میں کوئی قید طلب وغیرہ کی نہیں لگائی اور جہاں آخرت کا ذکر کیا ہے وہاں مقید کیا ہے سعی(۳) کے ساتھ۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔ ﴿وَمَنْ اَرَادَ

(۱) عادت کے مطابق (۲) سورۂ ھود (۳) کوشش کے ساتھ۔

الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا ﴾(۱) کہ ''جس نے آخرت کا ارادہ کیا اور اس کے لئے سعی کی'' یعنی ہم ذمہ داری نہیں کرتے۔ سن لو جو نیک عمل کرے گا جنت میں جائے گا۔

تعجب ہے کہ جس میں ذمہ داری کی ہے اس میں توکل کو عیب سمجھتے ہیں اور جس کی ذمہ داری نہیں کی اس میں توکل اختیار کرتے ہیں۔

بس جی جو بات جس طرح اپنی سمجھ میں آئی اس طرح کر لی۔ انبیاء علیہم السلام بھی صرف امور دنیوی میں سے اسباب ظنیہ کو ترک کر دیتے ہیں۔ اسباب قطعیہ کو وہ بھی ترک نہیں کرتے۔ کھانے کو ترک نہیں کرتے کیونکہ وہ تو اسباب قطعیہ سے ہے ہاں انہوں نے تدابیر معاش کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ اسباب ظنیہ سے ہے مولانا فرماتے ہیں:

انبیاء در کار دنیا جبری اند　　کافراں در کار عقبیٰ جبری اند
انبیاء را کار عقبیٰ اختیار　　کافراں را کار دنیا اختیار

انبیاء تو جبری اس معنی کو ہیں کہ امور دنیویہ کے بارے میں حس وحرکت نہیں کرتے ان کو چھوڑ دیتے ہیں اور کافر کار عقبیٰ میں جبری ہیں کہ اس کے اندر حس وحرکت نہیں کرتے ان کو ترک کئے ہوئے ہیں۔ انبیاء کار عقبیٰ کو اختیار کئے ہوئے ہیں ان کو نہیں چھوڑتے اور کافر کار دنیا کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ سو انبیاء کے جبری ہونے کے یہ معنی ہیں۔ جب انبیاء کی یہ حالت ہے کہ وہ اسباب قطعیہ کو ترک نہیں کرتے گو دنیوی ہی ہوں اور اخروی کو بدرجہ اولیٰ، تو اور لوگوں سے بڑی حیرت ہے کہ انہوں نے آخرت کے بارے میں توکل کیسے اختیار کر رکھا ہے کہ اس کی تحصیل میں حرکت ہی نہیں کرتے۔ مانا کہ اہل توکل تو یہ بھی ہیں مگر ایسی چیز میں توکل اختیار کیا ہے کہ اس میں توکل درست نہیں۔

(۱) سورۂ بنی اسرائیل:۱۹۔

قلب واعمال کا تعلق

بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر اسباب فلاح آخرت کو بیان کیا ہے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ مطلق فلاح کے اسباب بیان کئے ہیں۔ (صرف آخرت ہی کے نہیں) کیونکہ فلاح کے اندر کوئی قید نہیں لگائی پس وہ عام ہوگی فلاح دنیوی کو بھی۔ اور فلاح کو ذکر کر کے پھر اس کے طریقے بتلادیئے ہیں جن کے اختیار کرنے سے اخروی دنیا کی فلاح بھی میسر ہوتی ہے۔ (چنانچہ ختم وعظ کے قریب یہ مضمون مفصلاً مذکور ہے)

پس ارشاد ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾(۱) یہاں تین اعمال بیان کئے ہیں۔ ایک تزکی، ایک ذَکَرَاسْمَ رَبِّہٖ ایک صلی۔ یہاں پر تزکیہ سے عام بھی مراد لے سکتے ہیں۔ ذمائم باطنی سے بھی تزکیہ(۲) ہو اور معاصی جوارح سے بھی مگر دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ذمائم باطنی سے پاکی مراد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾(۳) ''اور قسم ہے انسان (جان) کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست بنایا پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں کا) اس کو القاء کیا یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس (جان) کو پاک کرلیا''

زکھا میں مفعول کی ضمیر نفس کی طرف ہے کہ نفس کا تزکیہ کرلیا۔ اس آیت میں تصریح ہے اس بات کی کہ مدار فلاح کا تزکیہ نفس کی طرف ہے کہ نفس کا تزکیہ کرلیا۔ اور ظاہر ہے کہ نفس کا تزکیہ اور اس کی پاکی ذمائم باطنی کے ازالہ سے ہوتی ہے۔

---

(۱) سورہ الاعلیٰ: ۱۴۔۱۵ (۲) باطنی بری عادتوں سے تزکیہ بھی ہو اور اعضاء وجوارح سے جو گناہ صادر ہوتے ہیں اس سے بھی تزکیہ ہو (۳) سورۃ الشمس: ۷ تا ۹۔

کیونکہ نفس بلاواسطہ انہیں کے ساتھ متصف ہے نہ کہ اعمال جوارح کے ساتھ۔ پس اس کا تزکیہ بھی انہی ذمائم سے ہوگا۔ لہذا اولیٰ یہ ہے کہ یہاں بھی ذمائم باطنی ہی سے تزکیہ مراد ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں جیسا کہ بعض لوگ آج کل کہتے ہیں۔ سو تزکیہ باطن کا حکم دینے سے حق تعالیٰ کا یہ مقصود نہیں کہ تزکیہ ظاہر ضروری نہیں ہے۔ اگر یہ مقصود ہوتا تو آگے ﴿وَ ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی﴾ کیوں فرماتے بلکہ مقصود یہ ہے کہ نفس کا پاک کرنا اصل ہے اور ظاہر اس کی فرع ہے۔

اسی طرح ایک موقع پر یزکیھم فرمایا ہے تو اس سے بھی اسی قرینہ سے تزکیہ نفس مراد ہے کیونکہ اصل چیز تو تزکیہ باطن ہی ہے۔ اگر تزکیہ باطن اصل چیز نہ ہوتی تو آپ ﷺ حدیث میں یہ کیوں فرماتے۔

التقویٰ ھھنا واشار الی صدرہ (۱) کہ تقویٰ یہاں پر ہے اور آپ ﷺ نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: الغنی غنی النفس۔ کہ غنی نفس کا غنا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ غنا ظاہری کوئی چیز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصل غنا تو نفس ہی کا ہے اور جب نفس میں غنا ہوتا ہے تو پھر ویسے ہی افعال صادر ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ مطلب نہیں کہ تقویٰ ظاہری کوئی چیز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کی جڑ تو قلب میں ہے اور جب تقویٰ قلب میں ہوتا ہے تو افعال بھی اچھے ہی صادر ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے کہ اگر تقویٰ قلب میں نہ ہوگا تو اچھے افعال کے صادر ہونے کا تقاضا نہ ہوگا۔

غرض خوب سمجھ لیجئے کہ جب قلب (۲) کی اصلاح ہوجاتی ہے تو اعمال بھی

(۱) الصحیح لمسلم کتاب البر والصلہ: ۳۲، سنن الترمذی: ۱۹۲۷، مسند أحمد ۲: ۲۷۷ (۲) دل۔

درست ہوجاتے ہیں۔ سو اصل قلب ہی کی اصلاح ہوگی مگر اصلاح قلب سے درستی اعمال ہوجانے کا یہ مطلب نہیں کہ بعد اصلاح ہوجانے کے اعمال کے قصد کی بھی ضرورت نہ ہوگی بلکہ معنی یہ ہیں کہ قلب کی اصلاح ہونے پر اعمال کا کرنا سہل ہوجائے گا یعنی قبل اصلاح کے جو اعمال مشکل تھے وہ بعد اصلاح کے آسان ہوجاویں گے۔ مگر قصد کی پھر بھی ضرورت رہے گی۔ اصلاح کا تو بس اتنا ہی اثر ہوتا ہے کہ اصلاح کے قبل بری باتوں کا چھوڑنا باوجود قصد کے بھی نہایت دشوار تھا۔ اصلاح کے بعد آسان ہوگیا۔ جو لوگ اصلاح شدہ ہوتے ہیں ان میں اور جو اصلاح شدہ نہیں ہوتے ان میں بس یہی فرق ہے کہ قصد تو سب کو کرنا پڑتا ہے۔

ریاضت نفس

مگر جن لوگوں کی اصلاح ہوچکی ہے ان کا کام تو معمولی قصد اور اشارہ ہی سے چلتا ہے اور جنہوں نے اپنی اصلاح نہیں کی ہوتی ان کو برے کاموں کے چھوڑنے میں سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اور بڑی دشواری پیش آتی ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ مثلاً ایک عورت سامنے کو نکلی۔ نفس کا تقاضا ہوا کہ اس کو دیکھ لو اگر قلب کی اصلاح ہوگئی ہے تب بھی نفس کو روکنے کے لئے ارادہ کی تو ضرورت ہوگی مگر تھوڑے قصد سے نفس کو روک سکتے ہیں۔ ذرا سا اشارہ کافی ہے اور اگر اصلاح نہیں ہوئی ہے تو باوجود قصد کرنے کے بھی نفس کے روکنے میں سخت دشواری پیش آئے گی اور جو لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اصلاح ہوجانے کے بعد نفس میں گناہ کا تقاضا ہی نہیں رہتا سو یہ بالکل غلط ہے۔ ہاں وہ تقاضا ضعیف ضرور ہوجاتا ہے کہ اگر دبایا جائے تو نہایت آسانی سے دب جاتا ہے اور جس نے اصلاح نہیں کی ہوتی اس کو تقاضا نہایت شدید ہوتا ہے اس کے روکنے میں نہایت دشواری پیش آتی ہے۔

اب یہ شبہ جاتا رہا کہ جب تقاضا اصلاح شدہ اور غیر اصلاح شدہ دونوں کو ہوتا ہے پھر دونوں میں فرق کیا ہوا اور جب دونوں برابر ہیں تو پھر ریاضت کی حاجت کیا ہے سو میں نے دونوں میں فرق بتلا دیا۔

ریاضت کردہ کی مثال ایسی ہے جیسے شائستہ گھوڑا اور جس نے مجاہدہ نہیں کیا اس کی مثال ایسی ہے جیسے شریر گھوڑا۔ سوار اگر ماہر ہو تو شائستہ گھوڑے کو اگر وہ شوخی کرے تو ذرا سا اشارہ کافی ہو جاتا ہے بخلاف شریر گھوڑے کے کہ اس کے درست کرنے میں ماہر کو بھی بڑی کلفت (۱) پیش آتی ہے شہسوار اپنے زور سے قابو میں لے آئے وہ اور بات ہے مگر دقت ضرور ہوگی بخلاف شائستہ گھوڑے کے کہ وہ آسانی سے قابو میں آجاتا ہے یہ فرق ہے نفس کی ریاضت اور عدم ریاضت میں۔

رہا میلان معاصی (۲) کی طرف سو وہ دونوں کو ہوتا ہے۔ ایسا کوئی شخص بھی نہیں کہ اس کو میلان نہ ہو ہاں قبل ریاضت داعیہ قوی ہوتا ہے (۳)۔ اس لئے اس کا روکنا مشکل ہے مگر طاقت سے باہر نہیں صرف دشواری ہے اور نفس اس دشواری کو گوارا نہیں کرتا مثلاً نگاہ کا نیچا کرنا کہ یہ طبیعت کو بہت گراں ہوتا ہے۔ نفس اس گرانی کا تحمل نہیں کرتا پس وہ اس کی طرف نگاہ کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ پھر توبہ کر لیں گے۔ بخلاف ریاضت کے کہ داعیہ تو ہوتا ہے مگر ہوتا ہے ضعیف۔ اور پھر ریاضت سے مدافعت (۴) کی قوت پیدا ہو جاتی ہے بہت زیادہ۔ اس لئے وہ بہت آسانی سے اس کی مدافعت کر سکتا ہے کہ داعیہ ضعیف ہے اور قوت دافعہ زبردست ہے۔ بس اس واسطے ریاضت مجاہدہ کرتے ہیں۔

سو تزکیہ نفس کا جو حکم کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اثر ہے کہ اس کی اعانت سے (۵) ظاہر اعمال بھی درست ہو جاتے ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے

(۱) بہت مشکل (۲) گناہوں کی طرف طبیعت دونوں کی مائل ہوتی ہے (۳) مجاہدے سے پہلے تقاضا قوی ہوتا ہے (۴) اس سے بچاؤ کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے (۵) اس کی مدد سے۔

نفس کے متعلق فرمایا۔ قد افلح من تزکی۔ ''بامراد ہوا جو شخص (خبائث عقائد واخلاق سے) پاک ہوگیا''۔

اصلاح ظاہر و باطن

باقی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صرف یہی کافی ہے ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ فقط قلب کا درست کرلینا کافی ہے۔ یہ لوگ شریعت کو منہدم (۱) بلکہ منعدم کرنا چاہتے ہیں کیونکہ تمام شریعت بھری ہوئی ہے اصلاح ظاہر و باطن سے اور تصوف کی حقیقت بھی یہی ہے کہ تعمیر الظاھر والباطن ''ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح ہو''۔

اور دونوں ہی کی ضرورت بھی ہے۔ بعض وجوہ سے اصلاح باطن کی اور بعض وجوہ سے اصلاح ظاہر کی۔ بہرحال صرف اصلاح باطن کافی نہیں کہ ظاہر ترک کردیا جائے۔ اور باطن ہی پر اکتفا کیا جائے اور اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ محض باطن مقصود ہے مگر یہ ضروری ماننا پڑے گا کہ: (الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ) جب کوئی چیز پائی جائے گی تو اپنے لوازم کے ساتھ پائی جائیگی یہ قاعدہ مسلمہ ہے۔ مثلاً آفتاب کے لئے دھوپ لازم ہے جب آفتاب نکلے گا تو دھوپ ضرور ہوگی یا تین کے عدد کو فرد ہونا لازم ہے۔ جہاں تین کا عدد صادق آئے گا وہاں فرد بھی صادق آئے گا۔ جب یہ معلوم ہوگیا تو سمجھ لیجئے کہ جس وقت باطن میں کوئی کیفیت ہوتی ہے تو ظاہر میں اس کا ظہور ضروری ہے مثلاً کسی کے دل میں غصہ کی کیفیت ہو تو چہرہ پر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے کہ چہرہ سرخ ہوجاتا ہے اور رگیں گردن کی پھول جاتی ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ دل میں تو محبت ہو اور محبوب کی طرف نہ ہاتھ بڑھے نہ اس

(۱) گرانا بلکہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔

کی طرف پاؤں چلے۔ ایسا نہ سنا اور نہ دیکھا جب دنیا کی محبت میں یہ حالت ہے جو کہ نہایت ضعیف ہے تو پھر خدا تعالیٰ کی محبت میں جو کہ اقویٰ ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ قلب میں تو حق تعالیٰ کی محبت ہو اور زبان پر کلمات مدح کے آتے نہ ہوں اور عجز و نیاز ظاہر نہ ہوتا ہو۔ اگر ایسا ہے کہ ظاہر میں آثار نہیں پائے جاتے تو سمجھا جائے گا کہ اس کو خدا تعالیٰ کی محبت ہی نہیں ہے۔ ورنہ ممکن نہیں کہ قلب میں خدا کی محبت ہو اور اس کے سامنے جھکا نہ جائے اس سے ثابت ہوگیا کہ ظاہر لازم ہے باطن کے لئے۔ پس جب تزکیہ باطن ضروری ہوا تو تزکیہ ظاہر بھی بوجہ لازم ہونے کے ضروری ہوا۔ لہذا تزکیہ باطن و تزکیہ ظاہر دونوں ضروری ہوئے۔ اور گو ضروری دونوں تھے مگر چونکہ اصل تزکیہ نفس ہی تھا۔ اس لئے (قد افلح من تزکی) (بامراد ہوا جو شخص (خبائث عقائد و اخلاق سے) پاک ہوگیا میں اس کو بیان کیا۔

درستی جوارح وقلب

آگے ہے وَ ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی۔ (اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا) پہلی آیت میں تو تزکیہ باطن کا ذکر تھا اور اس کے اندر ایک ظاہر۔ اور جو من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن (۱) ان دونوں کے تزکیہ کا ذکر ہے۔ وہ اس طرح کہ عمل تین حال سے خالی نہیں۔ یا تو اس کا تعلق باطن سے ہے یا افعال جوارح سے (۲) اور یا زبان سے۔ اعمال جوارح تو ظاہر ہیں اور زبان برزخ ہے کہ من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہے (۳) حساً بھی۔ چنانچہ اگر منہ بند رکھو تب تو زبان باطن میں داخل ہے اور جو منہ کھول دو تو ظاہر۔ ایک تو وجہ ہے زبان کے من وجہ اور من وجہ ظاہر باطن ہونے

(۱) جو ایک حیثیت سے ظاہر اور ایک حیثیت سے باطن ہے (۲) ہاتھ پیر سے (۳) زبان کا شمار ایک حیثیت سے ظاہر میں ہوتا ہے اور ایک حیثیت سے باطن میں۔

کی۔ اور احکام میں بھی چنانچہ دیکھ لیجئے آب دہن (تھوک) اگر حلق کے اندر چلا جاوے تو روزہ نہیں ٹوٹتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باطن ہے اور اگر کوئی چیز چکھ کر تھوک دی جائے تو اس سے بھی روزہ نہیں جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ظاہر ہے اور چونکہ زبان برزخ ہے اس لئے جداگانہ قسم قرار دی گئی۔

پس وَ ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ''اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا'' میں تزکیہ ظاہر اور تزکیہ ماہو بین الظاہر والباطن (یعنی برزخ) دونوں کا ذکر ہوگیا ہے۔ صلّی تو ظاہر کے متعلق ہے اور ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ۔ زبان کے متعلق جو کہ من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہے۔ غرض دونوں قسم کے تزکیہ کا ذکر اس آیت میں آ گیا۔

پس خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ باطن کی بھی اصلاح کرو اور ظاہر کی بھی اصلاح کرو اور ایسی چیز کی بھی اصلاح کرو جو من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہے حاصل یہ کہ تین فعل ہیں۔

(۱) زبان کی درستی (۲) جوارح کی درستی (۳) قلب کی درستی

پس مطلب یہ ہوا کہ ہر قسم کی درستی کرو اور چونکہ وہ امور جن کی درستی ہونا چاہیے اتنے ہیں کہ ہر وقت زبان سے انکی تفصیل یاد رکھنا مشکل تھا اور بدون استحضار(۱) درستی کا اہتمام مشکل۔ اس لئے اس کی سہولت کے لئے بجائے اس ساری فہرست کے ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ''اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا'' فرمادیا۔

راز اس کا یہ ہے کہ اس میں ایک ضابطہ بتلاتے ہیں کہ اگر اس کو اختیار کرلو گے تو بآسانی تمام امور کی درستی پر قادر ہوجاؤ گے۔ ان سب کی فہرست یاد رکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

(۱) بغیر ذہن میں حاضر ہوئے اصلاح نہیں ہوسکتی۔

برائیوں سے بچنے کا طریق

اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر اپنا اصل کام ذکر کو سمجھو گے تو خود بخود سب چیزوں سے رک جاؤ گے۔ غلطی ہماری یہ ہے کہ ہم اصل کام ذکر کو نہیں سمجھتے۔ اسی واسطے برائیوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں ورنہ برائیوں میں کبھی مبتلا نہ ہوں۔ مشائخ برائیوں کے چھوڑنے کی تعلیم تفصیلاً بھی کرتے ہیں مگر سب سے سہل یہ طریقہ ہے کہ اپنے لئے ایک اصل کام تجویز کرلے پھر اس میں مشغول ہونے سے خود ہی سب برائیاں چھوٹ جائیں گی۔ وہ اصل کام ذکر ہے۔ تو جو چیزیں اس میں مخل ہوں گی خود بخود ان سے انقباض ہوگا(۱) تو بقدر ضرورت ہوگا اور ضرورت اسے کہتے ہیں کہ بدوں(۲) اس کے ضرر ہونے لگے۔

مثلاً نوکر کو کوئی ایسا کام بتلانا ہے کہ اگر نہ بتلائے گا تو ضرر ہوگا۔ یہ ضرورت ہے پس اس کو تو وہ اختیار کرے گا اور ایک ہے مشغلہ کے طور پر باتیں ہانکنا۔ سو یہ غیر ضروری ہے جو شخص ذکر کو اصلی کام سمجھے گا وہ کبھی اس میں مشغول نہ ہوگا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ حصہ لوگوں کے وقت کا ایسے ہی قصوں میں صرف ہوتا ہے۔ چنانچہ مجلسوں میں دوست آشنا بیٹھتے ہیں تو زیادہ وقت کا ہے میں صرف ہوتا ہے۔ صرف اسی میں کہ کہیں کی خبریں بیان کرتے ہیں۔ قصہ قضایا(۳) کا ذکر کرتے ہیں۔ کسی پر اعتراض کرتے ہیں۔ کسی کی برائی کرتے ہیں۔ ان چیزوں کو لوگوں نے اپنا مشغلہ بنا رکھا ہے۔ خاص کر اہل علم جو مبتلا ہوتے ہیں تو وہ اس میں عوام سے بڑھے ہوئے ہیں کیونکہ عوام الناس کو تو خبر بھی نہیں ہوتی کہ یہ معصیت ہے(۴) اور انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ معصیت ہے اور پھر کرتے ہیں۔

(۱) طبیعت رکے گی (۲) بغیر اس کے نقصان ہوگا (۳) قصے اور جھگڑوں کا تذکرہ ہوتا ہے (۴) گناہ ہے۔

غرض بڑا شغل اہل علم کا غیبت ہے(۱) اور غیبت بھی کس کی ابرار (۲) کی کہ اکثر ان کے یہاں علماء اور صلحاء کی برائیاں ہوتی ہیں۔ ہم لوگوں کی حالت افسوس کے قابل ہے۔ ساری خرابی یہ ہے کہ اس طرف توجہ نہیں کرتے کہ ہمارا اصلی کام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کیا اچھی تدبیر بتلائی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی کہ ذکر کو اصلی کام سمجھ لو تمام برائیاں چھوٹ جائیں گی۔

اہل علم کی نازک حالت

یہاں ظاہراً یہ مناسب معلوم ہوتا تھا کہ یوں فرماتے ذکر رَبِّہٖ فَصَلّٰی لفظ اسم کیوں بڑھایا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر ذکر ربہ فرماتے تو اس میں بعض سالکین کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ خدا کو کیسے یاد کریں کیونکہ یاد کرنا موقوف ہے تصور پر اور تصور بڑا مشکل ہے کیونکہ ان تک ہمارے ذہن کی رسائی کہاں ہوسکتی ہے ان کی تو یہ شان ہے۔

اے برتر از خیال و قیاس وگمان ووہم وز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت وبہ پایاں رسید عمر ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

''اے اللہ آپ ہمارے قیاس وخیال وگمان ووہم سے برتر ہیں۔ اور اس لئے بھی کہ جو کچھ ہم نے پڑھا اور سنا ہے۔ دفتر تمام ہوگیا اور عمر انتہا کو پہنچ گئی ہم ایسے پہلے ہی وصف رہے ہیں''

اور یہ شان ہے:

در تصور ذات اورا گنج کو مادر آید در تصور مثل او

''اس کے ذات کے تصور میں کہاں گنجائش ہے کہ اس کے مثل کا تصور آسکے''

اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ جب حضرت حاجی صاحب ہجرت کرکے حرم

(۱) اہل علم کا بڑا کام غیبت ہے (۲) نیک لوگوں کی۔

شریف میں پہنچے تو وہاں ایک شیخ مثنوی کا درس دے رہے تھے۔ حضرت بھی شریک درس ہوکر سننے لگے۔ وہ شیخ اس شعر کا مطلب بیان کررہے تھے مگر معنی نہیں بنتے تھے۔ وہ بتکلف اس کو بنارہے تھے۔ حضرت نے اس تقریر پر اعتراض کیا تو وہ خفا ہوگئے اور فرمانے لگے کہ اگر یہ معنی غلط ہیں تو صحیح معنی آپ فرمادیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھ کو معلوم نہ تھا کہ یہاں یہ قاعدہ ہے کہ پوچھنے والے سے ناخوش ہوجاویں۔ ہمارے یہاں تو یہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اور پوچھنے پر برا نہیں مانتے اصل بات تو یہی ہے کہ اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا حضرت نے فرمایا کہ ہمیں تو اساتذہ سے اسی طرح پہنچا ہے کہ یہ گنج کو ہے۔ بس یہ سن کر وہ پھڑک گئے کہ بیشک اسی طرح ہونا چاہیئے۔

نفس کی شرارت

غرض یہ کہ ذکر ربہ فرمانے سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ ذات حق کا جب تصور نہیں ہوسکتا تو اس کی یاد کیسے ہوسکتی ہے۔ بعض سالکین کو اس قسم کے خطرات پیش آتے ہیں اور یہ سب شیطان کے حیلے بہانے ہیں کہ وہ خدا کی یاد سے روکنا چاہتا ہے۔

مجھے اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شخص میرے پاس کسی بات کے لئے تعویذ لینے آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ دعا کرو میں بھی دعا کروں گا کہنے لگے کہ ہماری زبان اس قابل کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ کلمہ بھی پڑھتے ہو یا نہیں۔ آپ کی زبان کلمہ کے قابل تو ہے اور کلمات دعائیہ کے قابل نہیں۔ اور میں نے کہا کہ ایمان افضل ہے یا دعا۔ جب ناپاک زبان سے ایمان کا کلمہ پڑھ لیتے ہو تو پھر دعا میں کیوں عذر کرتے ہو۔ کلمہ میں کیوں نہیں عذر کیا کہ ہماری زبان اس قابل کہاں ہے۔ بس کچھ بھی نہیں شیطان نے راہ مارا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس آرام چاہتا

ہے اور دعا میں ہے کلفت۔ اس لئے صرف تعویذ تو طلب کرتے ہیں کہ ایک بار لے کر بے فکر ہو جاتے ہیں اور جو کچھ پڑھنے کو بتلاؤں تو اس کو نہیں کرتے ظاہر میں تو یہ بات واضح کی ہے کہ ہم اس قابل کہاں ہیں مگر واقع میں نفس کی شرارت ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا کہ نفس آرام طلب ہے اور تعویذ میں کچھ کرنا پڑتا نہیں لے کر بازو پر باندھ لیا بس چھٹی ہوئی۔ اور پڑھنے میں ہے مصیبت۔ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے پڑھنے سے اور دعا سے گھبراتے ہیں۔

اسی طرح بہت سے لوگ ذاکر سالک جب ان پر خطرات ہجوم کرتے ہیں تو ان کے دل میں خیال جم جاتا ہے کہ ذکر سے فائدہ کیا ہوا خطرات بھی قطع نہیں ہوتے شیطان ان کے اس قدر پیچھے پڑا رہتا ہے کہ اس کے وساوس کی وجہ سے ذکر چھوڑ دیتے ہیں کہ جب بغیر وساوس کے ذکر ہوتا ہے نہیں تو پھر ذکر کرنا ہی بیکار ہے جیسے لوگوں نے قرآن شریف کے ساتھ عمل کیا ہے اور خیال جما لیا ہے کہ جب معنی نہیں سمجھتے تو قرآن ہی کو چھوڑ دو۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ اگر کسی کی اولاد بدصورت ہو تو اس کا گلا گھونٹ دو۔ یہ کتنی بڑی غلطی ہے بیہودہ حرکت ہے۔

غرض کہ ذکر اللہ کو بعض لوگ اس لئے بیکار سمجھتے ہیں کہ خدا تک ہماری رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر یاد کہاں۔ اہل سلوک تک اس میں مبتلا ہیں۔ اس واسطے حق تعالیٰ نے اس جگہ اسم کا لفظ آیت میں بڑھا دیا کہ اگر مسمی کا ذکر نہیں ہے تو اسم کا تو ممکن ہے اور بعض جگہ قرآن شریف میں ذات کے ذکر کرنے کو بھی فرمایا ہے۔ جیسے فاذکرونی اور کہیں صفت کے ذکر کو لائے ہیں۔ جیسے وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ مطلب یہ ہے کہ ذات کا تصور نہ ہو سکے تو صفات کا سہی۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو اسم اور لفظ ہی کا سہی۔ اسی لفظی ذکر سے پھر حقیقی ذکر بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس لفظی ذکر سے حقیقی ذکر کا قصد ہو۔ یہ قصد ہی ایسی چیز ہے کہ اس سے باطن میں ضرور اثر ہوتا ہے۔

طلب صادق کا اثر

بعض کو شبہ ہوتا ہے کہ نماز پڑھی مگر اثر نہیں ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ نماز سے قصد ہی نہیں کیا اثر ہونے کا اور جب قصد ہی نہ ہو تو اسکے بارے میں یوں فرماتے ہیں: ﴿اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ﴾(۱) کہ جب تم اعراض کرتے ہو تو ہم پیچھے نہیں لپٹتے پھرتے۔ حضرت طلب ہونی چاہیے۔ جب طلب ہوتی ہے تو ان کی یہ عنایت ہوتی ہے۔ من تقرب(۲) الی شبر اتقربت الیه ذرا عاومن تقرب الی ذرا عا تقربت الیه باعاالحدیث ۔ یعنی جب کوئی ایک بالشت میری طرف آتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کی طرف جاتا ہوں اور جو ایک ہاتھ آتا ہے تو میں ایک باع دو ہاتھ جاتا ہوں۔ اور جو پیادہ آتا ہے تو میں دوڑ کر آتا ہوں۔

یعنی انسان کے مسافت قطع کرنے سے کیا ہوسکتا مگر جب یہ قصد کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اس سے نزدیک ہو کر اس کو مقرب بنا لیتے ہیں۔ بس انسان کو چاہیئے کہ جو کچھ اس سے ہوسکے وہ کرتا رہے۔ بعض لوگ ریا کے خوف سے ذکر نہیں کرتے کہ جب ذکر کرتے ہیں تو ریا کا خیال ہوتا ہے۔ یہ بھی شیطان کا دھوکہ ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اول ریا ہوتی ہے پھر عادت ہوجاتی ہے پھر عبادت چنانچہ مشاہدہ کر لیجئے کہ اول اول جب کسی کو نماز میں امام بناتے ہیں تو وہ خوب بنا بنا کر پڑھتا ہے کہ مقتدیوں کو اچھا معلوم ہو۔ مگر دو چار دن کے بعد اس طرف التفات بھی نہیں رہتا۔ ریا ہمیشہ ریا نہیں رہتی۔

دوسرے یہ کہ جو ریا بلا قصد کے ہو تو یہ اس کے دور کرنے کا مکلّف ہی نہیں پس ریا کے دو درجے ہیں۔ ایک صورت ریا دوسری حقیقت ریا۔ یہ صورت ریا کو حقیقت ریا سمجھ لیا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب وہ تمہارے اختیار سے پیدا نہیں ہوئی ہے تو اس میں حرج کیا ہے۔

(۱) سورۂ ھود: ۲۸ (۲) مسند احمد: ۲/۴۱۳، الترغیب والترہیب للمنذری: ۴/۱۰۴، کنز العمال: ۱۱۷۹۔

مجھ سے ایک شخص نے شکایت کی ریا کی۔ تو میں نے کہا کہ بلاقصد ہے یا بالقصد، اختیاری ہے یا غیر اختیاری۔ انہوں نے کہا کہ غیر اختیاری ہے اس پر میں نے کہا کہ بس یہ وسوسۂ ریا ہے ریا نہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

وسوسہ اور اس کا علاج

حتی کہ اگر کفر کا بھی وسوسہ آئے اس میں بھی حرج نہیں۔ چنانچہ دیکھئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک دفعہ حضور ﷺ کی خدمت میں شکایت کی تھی کہ ہمارے قلب میں ایسی باتیں آتی ہیں کہ جل کر کوئلہ ہوجانا گوارا ہے مگر ان کا زبان پر لانا گوارا نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر کے وسوسے ہوں گے۔ حضور ﷺ نے سن کر فرمایا: الحمدلله الذی رد امره الی الوسوسة (۱) ''کہ خدا کا شکر ہے کہ اس کی کوشش وسوسہ ہی کے اندر محدود کردی''

ذکر میں لگنا اپنا کام ہے۔ وسوسہ آنا نہ آنا اپنا کام نہیں۔ اپنے کام میں لگنا چاہیے۔ اور جو اپنا فعل نہیں ہے۔ اس میں کیوں مشغول ہوئے کہ وہ مخل مقصود ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص بادشاہ کا طلبیدہ (۲) جارہا تھا۔ کسی حاسد کو خبر ہوئی وہ راستہ میں جا کھڑا ہوا۔ جب یہ وہاں سے گزرا تو اس نے پوچھا کہ کہاں جاتے ہو۔ اس نے کہا کہ بادشاہ کے دربار میں جارہا ہوں۔ اس نے بادشاہ کی شان میں گستاخی شروع کردی اگر یہ بادشاہ کا عاشق ہے اور بادشاہ کی ملاقات کا طالب ہے تو گستاخی سننے اور اس کے جواب دینے میں مشغول نہ ہوگا بلکہ سیدھا چلا جائے گا۔ حتی کہ اگر وہ کان میں منہ لگا کر گالیاں دے گا تب بھی ادھر ملتفت نہ ہوگا۔ کیونکہ حاسد کی غرض اس سے یہی ہے کہ اس مشغلہ میں اس کو لگالوں تاکہ دربار کی حاضری کا وقت جاتا رہے اور یہ بادشاہ کی عطایا سے محروم رہے۔

(۱) مسند احمد: ۱/۳۴۰، مشکوۃ المصابیح: ۷۳ (۲) بادشاہ کی تلاش میں۔۔

سو اگر یہ شخص ہوش سے کام لے گا تو سمجھ لے گا کہ یہ اس لئے شرارت کر رہا ہے کہ مجھ کو محروم کر دے۔ بس اس کو چاہیے کہ اس کی طرف التفات نہ کرے اور سیدھا چلا جائے۔ اس طریقہ سے یہ بادشاہ تک پہنچ جائے گا اور گستاخی کرنے والا اندر نہیں پہنچ سکتا پس اس کو مقصود بھی حاصل ہو جائے گا اور ان تکلیف دہ کلمات سے بھی نجات ہو جائے گی اور اگر یہ شخص اس کی باتوں کے جواب دینے میں لگ گیا اور تمام وقت اسی میں صرف ہو گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بادشاہ کے قرب سے محروم رہے گا۔

اسی طرح شیطان وساوس ڈال کر قرب الٰہی سے محروم رکھتا ہے۔ سو جو شخص وسوسہ کی فکر میں مشغول ہو جاتا ہے وہ ترقی سے رک جاتا ہے اور جو اس میں مشغول نہیں ہوتا ترقی کرتا رہتا ہے حتی کہ مقام قرب حاصل ہو جاتا ہے اور جب مقام قرب حاصل ہوتا ہے تو وساوس بھی منقطع ہو جاتے ہیں کیونکہ دربار میں شیطان کا دخل کہاں اور اسی لئے بزرگوں نے وسواس کا علاج تجویز کیا ہے عدم التفات یعنی وساوس کی طرف التفات ہی نہ کرے۔ اس کے سوا اس کی تدبیر نہیں۔

غرض کہ جیسے ریا کا وسوسہ ریا نہیں اسی طرح کفر کا وسوسہ کفر نہیں اور نہ مذموم (۱) ہی ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ وہ قلب کے اندر نہیں گو معلوم ایسا ہی ہوتا ہے کہ جیسے قلب کے اندر ہی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے آئینہ پر مکھی بیٹھی ہو اور اس کا عکس آئینہ میں پڑتا ہو۔ اس لئے اندر مکھی نظر آتی ہے حالانکہ اندر نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایسے غیر اختیاری وساوس قلب کے اندر نہیں ہوتے۔ قلب میں تو ذکر و محبت خدا کی ہوتی ہے اور وسوسہ قلب کے باہر ہے۔ اہل اللہ کے قلب میں اللہ کے سوا کوئی چیز نہیں ہوتی اس لئے سالک کو قلب قوی رکھنا چاہیئے اور کام میں لگے رہنا چاہیے۔ اگر زیادہ خلجان ہو تو یوں دل کو سمجھائے کہ اور کچھ نہ ہو ذکر لفظی تو ہے نہ یہ کہ اس فکر میں پڑ

(۱) قابل ملامت نہیں۔

جائے کہ یکسوئی کیوں نہیں ہوتی۔

ذکر وفکر

فکر دو ہیں۔ ایک تو اصلاح کی فکر سو یہ تو ہونا چاہیے اور ایک ہے یکسوئی اور کیفیات جس سے اصل کام ہی جاتا رہا مثلاً اس کا اہتمام کیا کہ قلب میں کوئی چیز نہ ہو اور اس میں کامیابی نہ ہونے سے یہ خیال کیا کہ میرا ذکر بیکار جارہا ہے۔ بس ذکر ہی کو چھوڑ بیٹھے۔ اور غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ منشا اس کا کبر ہے۔ یعنی اپنے کو اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ میں اپنے عمل و ذکر میں موجودہ حالت سے زیادہ کا مستحق تھا مگر مجھ کو ملا نہیں۔ اتنے دنوں ذکر کیا مگر ہنوز روز اول ہے(۱)۔ پس یہ کبر ہے ورنہ اگر سچا عاشق ہو تو اس کو بھی غنیمت سمجھتا کہ اس کا نام لینا تو میسر ہو گیا اسی واسطے تو کہتے ہیں ؎

ادائے حق محبت عنایت ست زدوست وگرنہ عاشق مسکین ہیچ خورسند است

''حق محبت کی ادائیگی سراسر دوست کی عنایت کے سبب ہے، ورنہ عاشق بیچارہ یونہی خوش وخرم ہے''

اگر تمام عمر ذکر لفظی ہی کی پابندی ہو جائے تو یہ بھی غنیمت ہے ہم تو اس کے بھی مستحق نہ تھے۔ غلو کرنا تواضع (۲) میں بعض اوقات کبر تک پہنچا دیتا ہے۔ دیکھو اس نے تواضع کی تھی کہ اپنی حالت کو حقیر سمجھا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ یہ خیال جمایا کہ میں کام تو اتنا کرتا ہوں مگر میری حالت ایسی بری ہے۔ بس کبر تک پہنچ گیا۔

صاحبو! ہماری نماز کیا ہمارا روزہ کیا۔ اس پر جو انعام بھی ہو جائے احسان سمجھنا چاہیے اب یہ خیال کرنا کہ مجھے زیادہ ملنا چاہیے تھا یہ ناقدری ہے۔ بہرحال لفظ اسم بڑھانے میں یہ نکتہ تھا۔

(۱) ابھی تک پہلے ہی دن کی سی حالت ہے (۲) تواضع میں حد سے تجاوز کرنا تکبر کا باعث ہو جاتا ہے۔

حضرت حاجی صاحب m فرماتے تھے کہ زبان سے اللہ اللہ کرنے کو غنیمت سمجھے حقیر نہ سمجھے۔ جب غنیمت سمجھے گا تو شکر کرے گا اور شکر پر وعدہ ہے۔ ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾(۱) اس سے ترقی ہوگی۔ پس جس کی طلب ہے اس تک پہنچ جائے گا خلاصہ یہ کہ ذکر اسم ربہ میں تمام برائیوں سے بچنے کی تدبیر بتلائی ہے کہ ذکر کرنے میں مشغول ہوجاؤ۔ سب برائیوں سے بچ جاؤ گے۔

فضیلت نماز

اس آیت میں ایک نکتہ اور ہے۔ وہ یہ کہ فصلّی میں تو فالائے اور ذکر اسم ربہ میں واؤ۔ حالانکہ ہے دونوں جگہ عطف۔ مگر اول میں واؤ کے ساتھ عطف کیا ہے اور دوسری جگہ فاء کے ساتھ۔ سو اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ نماز بعض وجوہ سے مقصود اعظم ہے کیونکہ ذکر پر نماز کی اس طور پر تفریع کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر مقدمہ ہے نماز کا اور اصل مقصود نماز ہے۔ پس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اول ذکر سے نماز کی قابلیت پیدا کی اور پھر نماز پڑھی۔

اس سے نماز کی مقصودیت عظمیٰ معلوم ہوئی۔ دوسرے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ''بامراد ہوا جو شخص (خبائث عقائد واخلاق سے) پاک ہوگیا'' کے ساتھ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ''اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا'' کی قید لگانے سے اشارہ اس طرف ہے کہ گو تزکیہ بہت بڑا عمل ہے مگر بغیر نماز کے فلاح کے لئے کافی نہیں۔ ہاں جب کہ تزکیہ کے ساتھ نماز بھی پڑھی تو اس وقت سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری فلاح ہوگئی۔ نماز سبب عظمیٰ ہے فلاح کا۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اذان میں حی (علی الفلاح) کیوں فرمایا ہے بات یہ ہے کہ فلاح لقب رکھ دیا ہے نماز کا۔ نماز ہی کو فلاح کے نام سے تعبیر کیا ہے

(۱) اگر تم شکر کروگے ہم مزید دیں گے۔

تا کہ لوگ سمجھ لیں کہ نماز فلاح کا ایسا سبب ہے کہ گویا عین فلاح ہے اور مسبب کے قائم مقام ہے۔ پس جس نے نماز پڑھی تو یوں کہیں گے کہ اس کو فلاح حاصل ہوگئی۔ اس سے نماز کا کیا رتبہ ثابت ہوتا ہے۔

نماز میں روزہ

تفصیل اس کی یہ ہے کہ نماز ایسی چیز ہے کہ اس کو تمام اعمال سے امتیاز حاصل ہے یعنی اعمال فرعیہ سے کیوں کہ ایک عمل تو ایسا ہے جو سب کی اصل ہے ایمان وہ تو نماز سے بھی افضل ہے۔ کیونکہ اگر ایمان نہ ہو تو نماز ہی نہیں ہوتی۔ اور ایمان بلا نماز کے بھی مفید ہو جاتا ہے (مثلاً انسان خلود فی النار(۱) سے بچ جائے) اور نماز کا امتیاز دوسری عبادات سے یہ ہے کہ نماز میں تمام عبادات موجود ہیں۔

اس کی مثال اس مرکب نسخہ کی سی ہے جس میں تمام اجزائے مفیدہ کو جمع کر دیا گیا ہو۔ ایسا خمیرہ یا معجون ظاہر بات کہ مفرد دوا سے زیادہ مفید ہوتا ہے سو اعمال جو کہ بمنزلہ غذا یا دوا کے ہیں نماز ان سب کا مجموعہ ہے کیونکہ دوا تو وہ ہے جس سے مواد خبیثہ کا ازالہ ہو اور غذا وہ جس سے مواد صالحہ پیدا ہوں۔ چونکہ اعمال شرعیہ میں یہ دونوں شانیں ہیں۔ اس لئے وہ بمنزلہ دوا اور غذا کے ہوئے۔ پس جتنے اعمال مفرد تھے نماز میں ان سب کو جمع کر کے ایک مرکب بنا دیا ہے۔

دیکھئے ایک عمل روزہ ہے، ایک تلاوت کلام اللہ ہے ایک اعتکاف ہے۔ روزہ کے فضائل اور تلاوت اور اعتکاف کے معلوم ہیں کہ کتنے کچھ ہیں سو جس عمل کے اندر یہ سب جمع ہوں گے ظاہر ہے کہ اس کی کیا کچھ فضیلت ہوگی اور وہ نماز ہے کہ اس میں ان میں سے تھوڑی تھوڑی سب چیزیں موجود ہیں۔ روزہ تو اس لئے کہ اس میں تین چیزیں ہیں کھانے اور پینے اور مقاربت(۲) کا ترک کرنا سو نماز

(۱) ہمیشہ کے لئے دوزخ میں جانے سے بچ گیا (۲) بیوی سے مجامعت۔

میں یہ سب چیزیں پائی جاتی ہیں وہ یہ کہ نماز کے اندر بہت سے ایسے مباحات سے بھی روک دیا گیا ہے جن سے روزہ میں اس قدر روک نہیں کی گئی۔ اس میں تو صرف تین چیزوں سے روکا گیا ہے اور یہاں چلنے پھرنے، ہنسنے بولنے، کھانے پینے سب سے ممانعت ہے۔ بولنا بھی منع ہے حتی کہ دعا بھی وہ درست ہے جو مشابہ کلام ناس کے نہ ہو۔

کلام الناس سے فساد نماز

اگر اللہ سے باتیں کرو تو ایسی نہ ہوں جس کا سوال لوگوں سے کر سکتے ہو۔ اگر ایسی دعا کرو گے تو نماز فاسد ہو جائیگی۔ گو عربی میں ہو اور جو مشابہ کلام ناس کے نہ ہو وہ مفسد نہیں۔ گو اردو ہی میں ہو۔ تو ایسی دعا اردو میں ہونے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو میں دعا کیا کرو بلکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ اردو میں دعا کرنے سے نماز نہیں ٹوٹتی جب کہ وہ کلام ناس کے مشابہ نہ ہو لیکن بجز عربی کے دوسری زبان میں ہونا ہے حرام اور جن صورتوں میں نماز فاسد ہو جاتی ہے سو اس کا فساد بوجہ اس کے نہیں کہ اردو میں ہے بلکہ بوجہ مشابہت کلام ناس کے ہے۔

اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ ہمارے ایک دوست کہتے تھے کہ ہم نے منیہ میں پڑھا تھا کہ کلام ناس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ آپ اس کا مطلب یہ سمجھے کہ عربی کے سوا اردو وغیرہ بولنے سے نماز جاتی رہتی ہے اور عربی میں بولنے سے نہیں جاتی۔ اتفاق سے امام کو سہو ہوا کہ قعدہ اولیٰ کو قعدہ اخیر سمجھ گیا اس وجہ سے بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ حتی کہ سلام پھیرنے کے قریب ہوا تو آپ کہتے ہیں۔ قُم۔ امام کو سن کر خود یاد آ گیا کہ یہ قعدہ اولیٰ ہے اس وجہ سے کھڑا ہو گیا یہ دل میں کہنے لگے کہ عربی سے بڑا فائدہ ہے۔ نماز فاسد بھی نہ ہوئی اور کام بھی بن گیا۔ امام صاحب نے بعد نماز کہا کہ قم والا کون تھا یہ بولے میں تھا۔ امام صاحب نے کہا کہ بھائی اس

طرح نماز فاسد ہوجاتی ہے۔تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے کلام ناس کے ساتھ تکلم تھوڑا ہی کیا ہے۔آپ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ جو بات عربی میں ہو وہ کلام ناس نہیں ہوتی۔کلام ناس وہ بات ہوتی ہے جو کہ غیر عربی اردو وغیرہ میں ہو۔

عربی پر دوسری حکایت یاد آئی کہ ایک رئیس لغت بہت بولتے تھے ان کی اسامیوں میں سے کچھ گنواران کے پاس آئے۔رئیس صاحب نے پوچھا امسال تمہارے زار گندم پر تقاطر امطار(۱) ہوا یا نہیں۔گنوار لوگ اس کو سن کر متحیر تھے کہ جانے میاں کیا کہہ رہے ہیں۔انہوں نے یہ لغات کہاں سنے تھے ایک گنواران میں ہوشیار تھے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ اس وقت میاں قرآن پڑھ رہے ہیں پھر آئیو جب آدمیوں کی بولی بولیں گے۔

خلاصہ یہ کہ کلام ناس سے خواہ عربی میں ہو یا غیر عربی میں نماز فاسد ہوجاتی ہے۔سو نماز وہ چیز ہے کہ کھانا پینا تو درکنار کلام کرنے تک سے بھی وہ فاسد ہوجاتی ہے(۲) جب کہ وہ کلام ناس سے ہو۔اور کسی مخلوق سے کلام کرنا تو کہاں خود حق تعالیٰ سے ایسا کلام کرنا جو آدمیوں سے ہوسکتا ہے اس سے بھی تو نماز فاسد ہوجاتی ہے۔ہاں جو چیز بندوں سے نہیں مانگی جاتی جیسے مغفرت اس سے نماز نہیں جاتی خیال کیجئے کہ نماز میں کتنا بڑا روزہ ہے۔

نماز میں ہنسنا اور رونا

چنانچہ نماز میں ہنسی کی بھی ممانعت ہے ہنسی کے تین درجے ہیں۔قہقہہ،ضحک، تبسم،قہقہہ میں نماز تو سب کے نزدیک فاسد ہوجاتی ہے۔لیکن حنفیہ کے نزدیک وضو بھی جاتا رہتا ہے۔اور ضحک (۳) سے نماز جاتی ہے وضو نہیں جاتا۔اور تبسم (۴) بے ادبی تو ہے مگر اس سے نماز نہیں جاتی۔کیونکہ شرعاً تبسم کو ہنسی قرار نہیں دیا گیا۔گویا وہ ملحقات

(۱) اس سال تمہارے گندم کے کھیت میں بارش ہوئی کہ نہیں (۲) نماز ٹوٹ جاتی ہے (۳) ہنسنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے (۴) مسکرانا۔

کلام ہی سے نہیں غرض ہیں یہ سب نماز کے خلاف، گو تبسم سے نماز نہ فاسد ہو پس نماز میں ہنسنے کا بھی روزہ ہوا۔

اب رونے کا حکم سنئے کہ نماز میں اس کی بھی ممانعت ہے۔ ہنسنے کا تو اس لئے روزہ ہوا تھا کہ وہ شان نماز کے مناسب ہی نہ تھا۔ مگر اس میں رونے کا بھی روزہ ہے۔ ہاں جنت اور دوزخ کے ذکر سے ہو تو اور بات ہے۔ حالانکہ رونا فی نفسہٖ وہ چیز ہے کہ اس میں پوری نیاز مندی کی شان ہے اور نیاز مندی کی شان ہر حال میں محمود ہی ہے۔ اگر رونا آخرت کے لئے ہو وہ تو محمود ہی ہے(۱) لیکن اگر دنیا کے لئے بھی ہو اس کو بھی دخل ہے قرب میں۔ کیونکہ رونا حزن وغم کی وجہ سے ہوتا ہے اور حزن وغم کی نسبت صوفیا کرام کہتے ہیں کہ بہت بڑی ریاضت ہے۔

ایک بزرگ رو رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ کیوں رو رہے ہو۔ جواب دیا کہ بھوک لگی ہے واقعی ان حضرات کو اپنی ہستی پر بالکل نظر نہیں ہوتی۔ اگر اپنی کچھ شان سمجھتے تو روٹی کے لئے ہرگز نہ روتے کیونکہ یہ خیال ہوتا کہ روٹی کے لئے رونا ہماری شان کے خلاف ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہوگا تو کیا کہے گا۔ غرض کہ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ بھوک کی وجہ سے رو رہا ہوں۔ کہنے والے نے کہا کہ شرم نہیں آتی بچوں کی طرح رو رہے ہو۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ خدا نے تو بھوک اس لئے لگائی ہے کہ میرا رونا دیکھیں جب وہ ہی ہمارا رونا دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہم کیوں نہ روئیں۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

''جب دین کا بادشاہ مجھ سے طمع کا اظہار کرے تو پھر ایسی قناعت پر خاک''

حقیقت کمال

حضرت عمر h بیمار تھے کسی نے پوچھا کہ کیسا مزاج ہے آپ نے فرمایا

(۱) پسندیدہ ہی ہے۔

طبیعت اچھی نہیں ہے۔ بظاہر یہ کلمہ شان استقلال کے خلاف معلوم ہوتا تھا۔ مگر ورنیاید حال پختہ ہیچ خام (۱)۔

عوام عارفین کی حالت کیا سمجھ سکتے ہیں۔ عوام تو عارفین کی اس حالت کو یوں سمجھتے ہیں کہ یہ شان استقلال کے خلاف ہے کیونکہ وہ بزرگی اسے سمجھتے ہیں کہ آدمی پتھر ہوجائے کچھ حس ہی نہ رہے بلکہ فطرت کے خلاف اس کے افعال صادر ہوں۔ بعض کی حالت یہ ہوئی ہے کہ ان کا بچہ مرگیا اور وہ ہنس پڑے۔ عوام ایسی حکایت کو بہت وقعت سے دیکھتے ہیں اور کمال سمجھتے ہیں حالانکہ کامل حالت وہ ہے جو مشابہ ہو رسول اللہ ﷺ کی حالت کے۔ آپ ﷺ کے صاحبزادے کا انتقام ہوگیا تو آپ ﷺ روئے۔ پس معلوم ہوگیا کہ مصیبت میں غم نہ ہونا کمال کی بات نہیں۔

پھر آج کل لوگ جو اس کو کمال اور بزرگی سمجھتے ہیں تو کیا بزرگی کے یہ معنی ہیں کہ کسی بات کا اثر ہی نہ ہو۔ حالانکہ بزرگوں پر تو ہر شے کا سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے۔ ہاں حدود سے باہر اس کے مقتضا پر عمل نہیں ہوتا۔ چنانچہ نامناسب بات سے بزرگوں کو غصہ آتا ہے اور تغیر ہوتا ہے مگر پھر بھی مقتضا پر عمل کرنے میں اعتدال ہوتا ہے۔ حسد سے تجاوز نہیں کرتے اور ان حضرات پر اثر کیسے نہ ہو۔ بادشاہوں کے حواس اتنے سلیم نہیں ہوتے جتنے ان حضرات کے ہوتے ہیں۔ ان کا ادراک بہت صحیح ہوتا ہے۔ اسی واسطے ان کو اولاد کی محبت بھی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

حضور ﷺ ایک مرتبہ خطبہ پڑھ رہے تھے کہ حضور ﷺ کے نواسے حضرت امام حسینؓ اور حضرت امام حسنؓ کھیلتے ہوئے آگئے۔ آپ ﷺ فرط محبت سے خطبہ پڑھ کر منبر سے اتر آئے اور پیار کیا اور پھر منبر پر تشریف لے گئے۔

(۱) عام آدمی عارفین کا حال نہیں سمجھ سکتا۔

ایک دفعہ حضور ﷺ کو پیار کرتے دیکھ کر ایک صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ میرے دس بیٹے ہیں۔ میں نے ان کو کبھی پیار نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے اس پر فرمایا کہ اگر خدا تعالیٰ ہی تمہارے دل سے محبت نکال لیں تو میں کیا کرلوں گا۔ خلاصہ یہ کہ حضرت عمر h بیماری میں کراہ رہے تھے جو بزرگ عیادت کو گئے تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ h کا مزاج کیسا ہے۔ آپ h نے فرمایا اچھا نہیں۔ وہ بولے آپ h بے استقلالی کی بات فرماتے ہیں حضرت عمر h نے فرمایا کیا میں خدا کے روبرو پہلوان بنوں۔ یہ ہیں عارفین۔

یہ حضرات گویا مزاج شناس ہوتے ہیں جس میں حق تعالیٰ کی رضا دیکھتے ہیں اس کے موافق عمل کرتے ہیں کہ اس وقت یہ مناسب ہے اور اس وقت یہ مناسب ہے یہ حکایت اس مناسبت سے بیان ہوئی تھی کہ حزن وغم بڑی ریاضت ہے۔

رونے کی اہمیت

اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک بزرگ ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ عادت یہ تھی کہ ضرورت میں قرض لے لیا۔ جب فتوحات (۱) ہوئی ادا کردیا۔ ساری عمر قرضہ میں گزری۔ حتی کہ خاتمہ کے وقت بھی مقروض تھے اور یہ کوئی بزرگی کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ جو قرضہ اللہ کے واسطے ہو وہ گناہ نہیں۔ سو یہ بھی اللہ ہی کے واسطے قرضہ لیا کرتے تھے۔ کیونکہ بزرگوں کے یہاں مہمان آتے ہیں۔ جب ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا ہے تو قرض لے کر ان کی مہمانی کرتے ہیں۔ پس لوگوں نے اس حالت میں آکر تقاضا کرنا شروع کیا کہ ہم نے آپ کو بزرگ سمجھ کر قرضہ دے دیا تھا اب ادا کیوں نہیں کرتے ہو۔ وہ بزرگ روکھے روکھے جواب دیتے تھے۔ جب قرض خواہوں نے بہت تنگ کیا تو منہ ڈھانک کر پڑ رہے۔

(۱) جب کہیں سے پیسے آئے ادا کردیا

اتنے میں ایک لڑکا حلوہ بیچتا ہوا نکلا اور اس نے آواز دی۔ انہوں نے اس کو بلوالیا اور پوچھا کہ تیرے پاس کتنا حلوہ ہے۔غرض وہ دو روپیہ کا اترا(۱)۔ آپ نے سب خریدلیا اور جتنے لوگ تقاضے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے ان سب کو کھلادیا حلوافروش نے دام طلب کئے تو یہ جواب دیا کہ دام ہوتے تو میرے پاس یہ برات(۲) کیوں نظر آتی۔ تو بھی ان ہی میں بیٹھ جا۔ لوگوں نے اور بھی لتاڑا کہ(۳)اس بچہ پر بھی آپ نے ظلم کیا۔ اگر ہمیں پہلے سے یہ معلوم ہوتا تو ہم کبھی ہرگز اس کا حلوانہ کھاتے۔ان کا یہ فعل لوگوں کو برا معلوم ہوا مگر

ورنیا یدحال پختہ ہیچ خام (۴)

اس لڑکے نے یہ حال دیکھ کر رونا شروع کیا کہ میرا استاد مجھے مارڈالے گا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک شخص سینی میں کچھ روپے اور حلوہ والے کے دام علیحدہ ایک کاغذ میں لپٹے ہوئے لے کر حاضر ہوا۔ وہ روپے سب قرض خواہوں کو تقسیم کئے تو اسی قدر تھے۔جس میں قرضہ ادا ہوجائے۔غرض سب کو بیباق کردیا(۵)۔کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت کیا بات تھی۔انہوں نے فرمایا کہ جب لوگ قرض طلب کرنے آئے اور مجھ کو تنگ کیا تو میں نے حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اے اللہ ان کا قرضہ ادا کرادیجئے میں نے آپ ہی کے واسطے قرض لیا تھا۔ وہاں سے جواب ملا کہ ہمارے خزانہ میں تو کچھ کمی نہیں۔مگر تمہارے یہاں کوئی رونے والا نہیں۔بس میں نے سوچا کہ کسی کو رلاؤ۔بس میں نے اس حلوہ والے کو منتخب کیا۔اسی کے متعلق مولانا m فرماتے ہیں ؎

تانہ گرید کودک حلوا فروش بحر بخشایش نمی آید بجوش
تانہ گرید طفل کے جوشد لبن تانہ گرید ابر کے خند دچمن

(۱) وہ سارا حلوہ دوروپے کا تھا(۲) میرے پاس اگر دینے کو پیسے ہوتے تو میرے پاس یہ مجمع کیوں نظر آتا(۳) برا بھلا کہا(۴) کامل کے حال کو ناقص نہیں سمجھ سکتا(۵) سب قرض اتار دیا۔

''جب تک حلوا بیچنے والا بچہ روتا نہیں، بخشش کے سمندر کو اس وقت تک جوش نہیں آتا۔ بچہ جب تک روئے نہیں ماں کو بھی دودھ پلانے کا خیال نہیں آتا۔ جب تک بارش نہ برسے چمن میں بہار نہیں آتی''

غرض رونا خواہ دنیا کی وجہ سے ہو اس پر بھی رحمت متوجہ ہوتی ہے۔ پس باوجودیکہ دنیا کی وجہ سے بھی رونا اقرب الی الخشوع اور مفتاح رحمت (۱) حق ہے مگر نماز میں اس کی بھی تو بندش ہے۔ ہاں اگر دین کے خوف سے آنکھ سے روئے مگر چلائے نہیں تو جائز ہے۔ دیکھا آپ نے کتنی بڑی شان ہے نماز کی۔

نماز میں چلنا

نیز نماز میں چلنے کا بھی روزہ ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر متصل (۲) چلا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر ایک قدم چلا اور ٹھہر گیا پھر ایک قدم چلا اور ٹھہر گیا تو نماز فاسد نہ ہوگی۔

ایک صحابی h کا قصہ ہے کہ وہ سفر میں تھے۔ نماز پڑھنے گھوڑے پر سے اترے گھوڑے کو چرنے چھوڑ دیا اور باگ کی رسی ہاتھ میں پکڑے ہوئے نماز پڑھنے لگے گھوڑا چرتا ہوا آگے سرکتا تو یہ بھی ایک ایک قدم سرک جاتے۔ ایک خارجی نے دیکھا تو کہا سبحان اللہ! یہ صحابی ہیں۔ میں نے حضورﷺ کی آسانی کا مشاہدہ کیا ہے۔ آپ سہولت پسند تھے۔ قدم بڑھانے کو دیکھا کہ گھوڑے کے ساتھ میں قدم بڑھاتا ہوں۔ اس پر اعتراض کیا مگر یہ نہ دیکھا کہ اگر میں ایسا نہ کرتا (یعنی باگ نہ پکڑے رہتا) تو گھوڑا بھاگ جاتا۔ میں پیادہ چلنے پر قادر نہیں۔ مجھ کو کتنی تکلیف ہوتی۔

اگر کوئی کہے کہ اگر تکلیف ہوتی بھی تو اس سے دین کا کیا ضرر تھا۔ (۳)

(۱) خشوع سے قریب تر اور رحمت حق کی چابی ہے (۲) مسلسل چلا (۳) دین کا کیا نقصان تھا۔

سو جواب یہ ہے کہ یہ کیا ضرور ہے کہ اللہ والے پریشان نہیں ہوتے۔ اللہ والوں کو پریشان اور مضطرب(۱) کسی بات میں نہ دیکھو گے۔ ہاں کمر میں درد ہوگیا۔ بیماری ہوگئی یہ تو دیکھو گے مگر پریشانی حقیقت میں جس کا نام ہے وہ ان کو نہیں ہوتی کیونکہ ایک حقیقت ہے پریشانی کی ایک اور صورت ہے اس کی۔ پس اہل اللہ میں پریشانی کی صورت تو ہوتی ہے کہ تکالیف وغیرہ میں مبتلا ہوتے ہیں مگر حقیقت پریشانی کی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی کہے کہ ایک شخص مر رہا ہے اور پھر بھی کہے کہ مر نہیں رہا۔ یہ تو زبردستی کی بات ہے ہم بزرگوں کو بڑی بڑی پریشانیوں میں مبتلا دیکھتے ہیں۔ کوئی بیماری کی مصیبت میں مبتلا ہے۔ کوئی فقر وفاقہ میں۔ پھر پریشانی کیسے نہ ہوتی ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ واقعات کو دیکھ لیجئے۔ اس سے اندازہ ہوجائے گا ان کے پاس رہ کر دیکھ لیجئے کہ ان میں پریشانی کے آثار ہیں یا نہیں۔ پریشانی میں آدمی بدحواس ہوتا ہے۔ واللہ وہ حضرات ہر حالت میں نہایت مطمئن ہوتے ہیں ان کی یہ حالت ہوتی ہے جیسے کسی کا محبوب ہو جس کے فراق میں یہ شخص مر رہا ہو کھانا تک چھوٹ گیا ہو۔ ناک پکڑنے سے دم نکلتا ہو اور وہ اتفاق سے مل جائے اور عنایت ومہربانی سے اس کی حالت پر ترس کھا کر بغل میں لے لے اور ایسا دبائے کہ آنکھیں نکلنے لگیں اور وہ یہ دیکھ کر کہ میرے دبانے سے اس کو تکلیف ہے امتحاناً یوں کہے کہ اگر تم کو تکلیف ہو تو میں چھوڑ دوں اور ایک تمہارا رقیب ہے بجائے تمہارے اس کو بغل میں لے لوں۔ اتنا ذوق تو سب کو ہے بتلایئے وہ کیا کہے گا وہ تو یہی کہے گا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

''دشمن کا یہ نصیب نہ ہو کہ آپ کی تلوار سے ہلاک ہو آپ کی خنجر آزمائی کے لئے دوستوں کا سر سلامت رہے''

(۱) بے قرار۔

کوئی شخص اس عاشق کو پریشان کہہ سکتا ہے؟ کیا اس کو دبانے سے تکلیف ہوگی ہرگز نہیں بلکہ عین راحت ہوگی۔ ہاں تکلیف جسم کو ہوگی مگر روح کو نہ ہوگی اور جمعیت واطمینان روح کے متعلق عین راحت ہوگی۔ ہاں تکلیف جسم کو ہوگی مگر روح کو نہ ہوگی اور جمعیت واطمینان روح کے متعلق ہے۔ کیا آپ نے کبھی آپریشن پچاس روپے دے کر نہیں کرایا۔ اس میں آہ بھی نکلتی ہے آنسو بھی نکلتے ہیں۔ اس پر کوئی کہے کہ آپریشن کرایا اور پھر یہ کہ پچاس روپے بھی دیئے تو یہی کہو گے کہ میری رگ رگ میں راحت سما گئی۔ معلوم ہوا کہ جسمانی تکلیف پر مدار نہیں پریشانی کا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جسمانی تکلیف ہوتی ہے اور روح کو پریشانی نہیں ہوتی سو اہل اللہ صورۃً پریشان ہیں حقیقۃً پریشان نہیں ہاں صورت تنعم کی ہے(۱)۔ خلاصہ یہ کہ اہل اللہ کو پریشانی نہیں ہوتی۔

غرض یہ کہ اگر وہ نماز میں گھوڑے کی باگ نہ پکڑتے تو وہ بھاگ جاتا اور مضرت آخرت(۲) کا بھی احتمال تھا کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب عبادت کی بدولت اس میں پریشانی ہوتی ہے تو نفس کہتا ہے کہ میں یہ عبادت نہ کرتا تو اچھا ہوتا عبادت ہی کی بدولت مبتلا ہوا۔ اسی واسطے شریعت نے یہ آسانی کردی کہ اگر چلنا متصل نہ ہو تو نماز ہوجائے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں کس قدر راحت کے احکام ہیں۔

نماز کا توڑنا

اگر کوئی کہے کہ ایسی صورت میں اگر گھوڑا دوڑنے لگے تو پھر کیا کریں گے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے ایسے وقت میں نماز توڑنے کی اجازت دی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص جوتا چراتا ہو تو نیت توڑ کر اس کو پکڑ لینے کی اجازت ہے یا چار آنے کی ہانڈی جاتی ہو(۳) یا خراب ہوتی ہو تو اس وقت بھی نماز

(۱) حقیقی پریشانی ہے جو بصورت انعام ہو رہی ہے (۲) آخرت کے نقصان کا (۳) عورت نماز پڑھ رہی ہو اور چولھے پر رکھی ہنڈیا جلنے لگے تو نماز توڑ کر اس کو بچانا جائز ہے۔

توڑ دینے کی اجازت ہے کون کہتا ہے کہ شریعت میں تشدد ہے۔ شریعت میں تو رائی برابر بھی تشدد نہیں بلکہ تشدد کی ممانعت ہے۔ دیکھئے جناب رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

لا ینبغی للمومن ان یذل نفسه (۱) ''یعنی مومن کو مناسب نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے'' صحابہ j نے عرض کیا: قالوا یا رسول الله کیف یذل نفسه ''یعنی اپنے نفس کو ذلیل کرنے سے کیا مراد ہے'' تو حضور ﷺ نے فرمایا: یتحمل من البلاء لما لا یطیقه ''یعنی ایسی بلا میں اپنے آپ کو پھنسائے جس کی برداشت نہ کر سکے''

دیکھئے حضور ﷺ تشدد سے کس طرح منع فرماتے ہیں اور کیسی آسانی سکھاتے ہیں اور شریعت کی ہر تعلیم ایسی ہی ہے۔ نماز ہی میں دیکھ لیجئے کتنی سہولت کے احکام ہیں کھڑے نہ ہو سکو تو بیٹھ کر اور بیٹھ نہ سکو تو لیٹ کر ادا کر لو۔ سفر میں ہو قصر کرو۔ دنیا کے واقعات میں غور کیجئے کہ ہر واقعہ میں سہولت کی کیسی تدابیر تعلیم فرمائی۔

جذبات طبیعہ کی رعایت

مرنے سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں۔ اس سے زیادہ کوئی امر پریشان کن نہ تھا۔ پھر اس کے بارے میں کیسی عمدہ تعلیم فرمائی ہے قرآن شریف میں ہے۔ ﴿اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ کہ جب ان پر مصیبت پڑتی ہے تو یوں کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں اس کے اندر ہم کو تسلی کا طریقہ بتلایا ہے کہ مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہنے سے تسلی ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم نے تو مصیبت میں اس کو پڑھا تھا مگر کچھ بھی نہ ہوا تو جواب یہ ہے کہ وظیفہ کی طرح پڑھنے کو کس نے کہا تھا بلکہ ساتھ میں اس کی حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیے وہ یہ کہ مصیبت آنے پر دو باتوں کا لحاظ رہے۔ ایک تو یہ کہ

(۱) سنن الترمذی: ۲۵۵۴، سنن ابن ماجہ: ۴۰۱۶، مجمع الزوائد: ۷/۱۷۴۔

ہم خدا کی ملک ہیں۔ ہم اپنے نہیں۔ جب خدا کے ہیں تو ان کو اختیار ہے کہ جیسے چاہیں ہم میں تصرف کریں۔ یہاں رکھیں یا اٹھالیں۔ اس میں تو عقل کی تسلی ہوگئی۔

دوسرے یہ کہ جہاں ہمارے عزیز چلے گئے ہیں ہم بھی وہیں چلے جائیں گے اس میں طبع کی رعایت ہے۔ ایک عقل اور ایک طبیعت۔ عقل تو ان اللّٰہ سے راضی ہوگئی تھی۔ کیونکہ عقل تسلیم کرتی ہے کہ جب ہم اللہ کے ہیں تو پھر ہم کو ان کے کسی تصرف پر رنج کرنے کا کیا حق ہے۔ ان کو اختیار ہے جیسے چاہیں کریں مگر طبع ابھی راضی نہ ہوئی تھی کہ باپ مرگیا اس کے مرنے کا کیسے رنج نہ ہو۔ تعلق ہی ایسا ہے کہ خواہ مخواہ رنج ہوتا ہے۔ اس کو ہم کیا کریں۔ اس لئے دوسرا جملہ طبع کے سنبھالنے کو بتلایا کہ جس عشرت کدہ میں وہ گئے ہیں ہم بھی وہیں چلے جائیں گے۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ جلدی ہی ملاقات ہوجائے گی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو حیدرآباد کی وزارت کا عہدہ مل گیا اور وہ وہاں چلا گیا اس کے بیٹے کو اس کے چلے جانے سے سخت صدمہ ہوا اور اس سے کہا گیا کہ تم کیوں گھبراتے ہو وہ تو بڑے عیش میں ہے وزارت کے عہدہ پر ہے اور تم بھی عنقریب وہیں بلالئے جاؤ گے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کا صدمہ اس کو سن کر باقی رہے گا یہ دوسرا جملہ طبع کی تسلی کے لئے بڑھایا ہے۔

غرض اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ''ہم سب اللہ کے لئے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں'' میں عقل وطبع دونوں کی تسلی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے جذبات طبیعہ کی کتنی بڑی رعایت کی ہے ساری دنیا کے عقلاء وحکماء جمع ہوجائیں تو بھی تسلی کا ایسا ذریعہ نہیں لاسکتے۔ دیکھئے جب انا للّٰہ کی حقیقت ملحوظ ہوگی کہ ہم سب خدا کی ملک ہیں۔ تو کسی عزیز کے مرنے سے خدا تعالیٰ کی شکایت عقلاً

تو اس کے لحاظ کرنے سے پیدا نہ ہوگی کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کی مِلک میں دو گھوڑے ہوں۔ ایک کو یہاں باندھ دے اور ایک کو دوسری جگہ باندھ دے ان کو کیا منصب ہے اعتراض کا کہ ایسا کیوں کیا یا الماری میں کسی کی دو بوتلیں رکھی ہوں۔ ایک کو نیچے کے تختہ پر رہنے دے اور ایک کو اوپر کے تختہ پر رکھ دے کسی کو کوئی اعتراض کا حق نہیں کہ ایک کو نیچے کیوں رکھا اور دوسری کو اوپر کس واسطے رکھ دیا۔ اس کی ملک ہے جو چاہے کرے۔

اسی طرح ہم سب اللہ کی چیزیں ہیں جس کو چاہیں یہاں رکھیں اور جس کو چاہیں وہاں اٹھالیں۔ کسی کو قیل وقال (۱) کی گنجائش نہیں۔ باقی جذبات طبیعت اپنا اثر ضرور کرتے ہیں تو دوسرے جملہ میں اس کی کتنی رعایت کی ہے۔ یہ نہیں کہ اس امر طبعی پر مواخذہ فرماتے بلکہ اسی اثر کو جائز رکھ کر اس کا تدارک کیا۔

عقل اور شریعت

اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ اگر قانون بنانے والا خدا کے سوا اور کوئی ہوتا تو اس کے بعد کسی کے مرنے پر رونے کی بھی گنجائش نہ ہوتی کیونکہ اور جو شخص قانون مقرر کرتا وہ حکم عقل کا اتباع کرتا اور عقل یہاں کہتی ہے کہ جب ہم اللہ کے ہیں تو وہ جو چاہے سو کرے ہم کو کیا حق ہے ان کے کسی تصرف پر حزن (۲) کرنے کا چہ جائیکہ رونا۔ مگر قربان جائیے شریعت کے رونے کی بھی اجازت دے دی بلکہ ایک قسم کی اس میں فضیلت بھی رکھ دی کہ ھو رحمۃ یعنی آنسو بہانا خدا تعالیٰ کی رحمت ہے حالانکہ عقل اس کو جائز بھی نہیں کہتی۔ دیکھ لیجئے کہ وہ رونا جس کو عقل حرام کہتی ہے۔ خدا کے قانون میں فضیلت قرار دیا جارہا ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل کے عقلا دین کے اندر اپنی عقل کو متبوع بناتے ہیں۔ بعض مسائل میں علماء سے مزاحمت (۳) کرتے ہیں

(۱) کسی کو باتیں بنانے کا حق نہیں (۲) غم کرنے کا (۳) علماء سے جھگڑتے ہیں۔

کہ یہ عقل کے خلاف ہیں۔ اس مقام پر وہ لوگ اپنی عقل سے استفتاء کریں اور بتلائیں کہ عقل زیادہ خیرخواہ ہے یا شریعت۔ عقل تو رونے کو جرم بتلاتی ہے اور شریعت اس کو اچھا شمار کرتی ہے۔ کس کے حکم میں آسانی ہے شریعت کے یا عقل کے ظاہر بات ہے کہ شریعت کا فتویٰ زیادہ رحم پر مبنی ہے۔ اب جو خیرخواہ ہے اس کے عوض عقل کو امام بنانا چاہتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

''میں نے عقل دور اندیش کو آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو پھر اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا''

شریعت اور راحت

اب سمجھ لیجئے کہ جب شریعت نے موت میں جو کہ اتنی بڑی پریشانی کا واقعہ ہے اس درجہ سہولت کی رعایت کی ہے اور اس قدر راحت پہنچائی ہے تو اور واقعات میں کیوں راحت کا سامان نہ کیا ہوگا۔ اسی طرح شریعت نے ہم کو ہر امر میں ایسا طریقہ بتلایا ہے کہ اس کے اختیار کرنے میں راحت ہی راحت ہے۔ اسی واسطے احکام شریعت کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے۔ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ کہ اللہ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان ہوتا ہے۔

اور ہر عمل صالح ذکر اللہ ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ جن اعمال کی تعلیم شریعت نے کی صرف انہی سے قلوب کو راحت اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ بذکر اللہ کو جو تطمئن سے مقدم لائے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے حصر کی طرف کہ شریعت کے احکام پر عمل کرنے کے سوا اطمینان اور راحت کا کوئی طریقہ نہیں۔ یہ ہے شریعت کی راحت رساں تعلیم جس کو ہم نے چھوڑ رکھا ہے۔

بہرحال ذکر اس پر تھا کہ شریعت نے روزہ میں بعض مباحات کی اجازت دی ہے مگر نماز میں نہیں دی۔ تو نماز میں روزہ کی شان روزہ سے بھی بڑھ کر ہوئی۔

نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا

روزہ میں اِدھر اُدھر دیکھنا جائز ہے نماز میں وہ بھی نہیں گو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ مگر ادب صلوٰۃ کے خلاف ہے۔ ہاں ادب نہ ہو نرا ضابطہ ہی ہو تو اور بات ہے۔ میرٹھ میں ایک مولوی صاحب تھے۔ نماز کے اندر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ نماز کے بعد اس شخص نے کہا کہ آپ نماز میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے آپ کی نماز ہی کیا ہوئی۔ بجائے اس کے کہ وہ مولوی ان کے ممنون ہوتے کہتے ہیں کہ میرے ادھر ادھر دیکھنے کی تمہیں جب ہی تو خبر ہوئی جب کہ تم نے مجھے دیکھا پس تمہاری نماز بھی نہیں ہوئی۔ بس وہ یہ کہہ کر سرخرو ہوگئے مگر کس کے سامنے مخلوق کے سامنے۔ اللہ کے سامنے تو سرخرو نہ ہوئے۔ مخلوق کے سامنے سرخرو ہونے سے کیا ہوتا ہے۔

کارہا باخلق آری جملہ راست　　باخدا تزویر وحیلہ کے رواست
کار با اوراست باید داشتن　　رایت اخلاص وصدق افراشتن

''مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ مکروحیلہ کب جائز ہے۔ حق تعالیٰ کے ساتھ سب کام درست رکھنا چاہئیں، اخلاص اور صدق کا علم بلند کرنا چاہیے''

اے صاحبو! حکام کے سامنے جتنا ادب ملحوظ رکھتے ہو کم از کم حق تعالیٰ کے سامنے اتنا تو رکھو۔ جب حکام کی ہیبت دنیا میں مانع ہے نگاہ اٹھانے سے(۱) تو حق تعالیٰ میں تو علاوہ ہیبت کے اور بہت سے امور بھی اس کے مقتضی موجود ہیں۔

(۱) نگاہ بلند کرنے سے روکتی ہے۔

مثلاً منجملہ ان کے ایک محبت بھی ہے۔ کیا ادھر ادھر دیکھنے کے لئے محبوب سے نگاہ ہٹاؤ گے۔ عشاق سے پوچھئے کہ محبوب کے سامنے موجود ہوتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنا کیسا ہے۔ عشاق کو تو محبوب سے ایک دم بھی غفلت گوارا نہیں ہوئی ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

''محبوب حقیقی سے تھوڑی دیر بھی غفلت میں نہ گزار، شاید وہ کسی وقت کم کردے اور تجھے اس کی خبر نہ ہو'

نماز میں تو غفلت کیسی غیر نماز میں بھی غفلت نہ چاہیے۔ حاکم کے سامنے تو ادھر ادھر دیکھتے ہی نہیں۔ اس خیال سے کہ شاید ہمیں نگاہ ہٹاتے ہوئے دیکھ لے۔ پس اللہ تعالیٰ تو ہر وقت ہمیں دیکھتے ہیں اور کسی وقت ہم سے توجہ نہیں ہٹاتے۔ پھر ان کے سامنے ادھر اُدھر دیکھنا کیسے جائز ہوسکتا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ قلب بھی دوسری طرف متوجہ نہ ہوتا۔ خیر اگر اس کو تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اس پر قدرت نہیں تو نگاہ پر تو قدرت ہے۔ نگاہ پر قدرت ہونے کا تو انکار نہیں کرسکتے۔ پس اس کو دوسری طرف کیوں متوجہ کرتے ہو۔ دوسرے اس میں کچھ فائدہ بھی تو نہیں ہے کیونکہ جن چیزوں کو دیکھتے ہو ان کو نماز کے اندر لے تو سکتے نہیں پس فعل عبث ہونے کی وجہ سے اس سے بچاؤ ہونا چاہیے۔ دیکھنے سے جب کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی تو پھر کیوں دیکھتے ہو۔

غرض یہ کہ نماز میں نگاہ کا بھی روزہ ہے اور چونکہ نماز میں قیود بہت ہیں کہ ہنسنے بولنے چلنے پھرنے، دیکھنے بھالنے اور اس کے علاوہ اور بہت سی باتوں سے ممانعت ہے اسی وجہ سے اس کی شان میں کہا گیا ہے۔ انھا لکبیرۃ ۔ کہ نماز بہت گراں ہے۔ کیونکہ جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ہمارے اندر ان کے تقاضے موجود ہیں۔

آج کل کی آزادی

ہمارا جی چاہتا ہے کہ بولیں بھی کھائیں پئیں بھی چلیں پھریں بھی بس ہر طرح سے آزاد رہنے کو طبیعت چاہتی ہے اسی لئے یہ نفس پر بہت شاق ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی تمام خواہشات سے رک جانا پڑتا ہے۔ مثلاً خوشی سے بیٹھے ہوئے ہیں، باتیں کر رہے ہیں، چلتے پھرتے ہیں مزے اڑا رہے ہیں۔ بس نماز کا وقت آیا اور خدا کی جانب سے حکم ہوا کہ ایک گھنٹہ کے لئے ہمارے دربار میں آؤ اور اپنی خواہشات کو چھوڑو۔ بس مصیبت آ گئی۔

بات یہ ہے کہ انسان مقید ہونا نہیں چاہتا اور شریعت نے مقید کیا ہے۔ دونوں کی مرضی اللہ کی مرضی اور بندہ کی مرضی۔ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لئے نماز لوگوں پر بھاری ہے۔ اسی لئے اس کے حق میں فرمایا کہ اِنهَا لَكَبِيْرَةٌ کہ اس سے آزادی کا خون ہوتا ہے۔ جس کا آج کل ہر وقت سبق گایا جاتا ہے۔ مگر یہ آج کل کی آزادی ہے عجیب کہ لوگ صرف شرعیات میں آزاد رہنا چاہتے ہیں کہ کوئی قید شرعی ہمارے اوپر نہ رہے ہم تو جب جانیں کہ تکوینیات میں بھی آزادی اختیار کر لو کہ خدا مارنا چاہے اور نہ مریں۔ طاعون میں مبتلا کرنا چاہے اور مبتلا نہ ہوں۔ بس جیسے تکوینیات میں آزاد نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح شرعیات کو سمجھ لو کہ اس میں بھی آزاد نہیں ہونا چاہیے حق تعالیٰ نے جو امر بھی فرمایا ہے اس میں اپنے آپ کو مجبور خیال کرو۔

خشوع کی حقیقت

اب جہاں حق تعالیٰ نے ہمارے مرض کا بیان کیا ہے (کہ نماز بھاری ہے) وہاں اس کا علاج بھی بتلا دیا چنانچہ فرماتے ہیں : ﴿ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى

الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾(۱)

یعنی نماز سب پر بھاری ہے مگر خشوع کرنے والوں پر بھاری نہیں جن کو یقین ہے اس بات کا کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور وہ اسی کی طرف جانے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ نماز بھاری ضرور ہے بوجہ قیود کے مگر جو لوگ اپنے اندر خشوع پیدا کر لیتے ہیں اور حق تعالیٰ سے ملنے اور ان کے پاس جانے کا خیال جما لیتے ہیں۔ ان پر بھاری نہیں ہوتی۔ سو اس کے اندر ہمارے مرض کا پورا علاج بتلا دیا کہ طریقہ خشوع سے نماز پڑھو تو کچھ گرانی نہیں رہے گی۔

اب خشوع کو لوگ جانے کیا سمجھتے ہیں حتیٰ کہ اس کو اختیاری بھی نہیں سمجھتے سو خشوع کی حقیقت لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سوائے حق کے کسی قسم کا خطرہ نہ آئے یہ غلط ہے۔ خشوع کی حقیقت یہ ہے کہ خطرہ خود نہ لاوے گو از خود آجائے اور یہ نہ آنا تو غیر اختیاری ہے لیکن نہ لانا اختیار میں ہے۔ آورد خطرات منافی خشوع ہے(۱)۔ آمد خطرات منافی نہیں(۲)۔ آمد و آورد (۳) میں فرق ظاہر ہے۔ ہاں البتہ یہ بھی کرنا چاہیے کہ جب وسوسہ بلا قصد آئے تو اس میں بقصد مشغول نہ ہو جائے۔ بعض ایسا کرتے ہیں کہ وسوسہ خود لاتے تو نہیں لیکن جب آتا ہے تو اس میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی غلطی ہے نہ قصد سے لانا ہو نہ قصد سے ابقاء ہو(۴)۔ کیونکہ بقصد باقی رکھنا بھی منافی خشوع ہے بس جب وسوسہ آئے تو اس کو رکھے نہیں، دفع کر دے۔

دفع وساوس کے طریق

ایک بات دقیق ہے قابل یاد رکھنے کے وہ یہ کہ عارفین کے نزدیک دفع کا

(۱) سورۃ البقرہ: ۴۵، ۴۶ (۱) وساوس کو خود لانا خشوع کے خلاف ہے (۲) وساوس کا خود بخود آنا خشوع کے خلاف نہیں (۳) آنے اور لانے میں فرق ظاہر ہے (۴) نہ ارادۃً لائے نہ ارادۃً باقی رکھے۔

مطلوب ہونا تو سب کو معلوم ہے۔ اب اس میں گفتگو ہے کہ کس طریقہ سے دفع کرنا چاہیے۔ سو اس کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ صورت ہے کہ براہ راست وساوس کو ہٹادے کہ جب کوئی وسوسہ آئے کوشش کر کے اس کو اپنے خیال سے دور کردے۔ اس میں تو بہت دقت ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا کہ دفع کرتے ہیں مگر دفع نہیں ہوتا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بواسطہ ہٹائے یہ عمدہ تدبیر ہے اس کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک مقدمہ سن لو۔ وہ یہ کہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ النفس لا تتوجہ الی شیئین فی ان واحد۔ کہ نفس کی توجہ ایک وقت میں دو چیز کی طرف نہیں ہوتی۔

اب سنئے بواسطہ دفع یہ ہے(۱) کہ قلب میں کسی دوسری چیز کو لے آؤ۔ دوسری چیز کے لانے سے اس کی طرف توجہ ہوجائے گی۔ اور وسوسہ کی طرف توجہ نہ رہے گی۔ اب بعض مشائخ دفع بلا واسطہ(۲) بتلاتے ہیں۔ اس میں نہایت دقت واقع ہوتی ہے کیونکہ بلاواسطہ ہٹانے میں یہ تو ہوتا نہیں کہ دوسری طرف توجہ ہو اور اس توجہ کی وجہ سے وسوسہ کی طرف توجہ ہوجاتی ہے۔ اس میں خود وسوسہ کی طرف توجہ ہوجاتی ہے گو بقصد دفع سہی مگر استحضار تو ہوا(۳)۔ اس لئے اس کا دفع ہونا(۴) مشکل ہوجاتا ہے اس وسوسہ کی مثال تار بجلی کی سی ہے کہ وہ تمہیں لگے جب لپٹے۔ اور جو تم اس کو لگو ہٹانے ہی کے لئے سہی جب لپٹے۔ بس وسوسہ ہٹانے کی تدبیر یہ ہے کہ بواسطہ ہٹاؤ۔ وہ یہ کہ دوسری چیز کی طرف متوجہ ہوجاؤ۔

اب رہی یہ بات کہ وہ کون سی چیز ہے جس کی طرف متوجہ ہو آیا پتھر کی طرف یا اور کسی چیز کی طرف ہو اس کی تعیین میں ضرورت ہے دلیل شرعی کی جو حضور ﷺ فرماتے ہیں۔ مقبلا علیھما بقلبہٖ کہ قلب کو متوجہ کرے دونوں رکعت یعنی نماز کی طرف۔

اب نماز کی طرف متوجہ ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ پوری نماز کی

(۱) کسی واسطے کے ذریعہ وسوسہ کو دور کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ دل میں کسی دوسری چیز کو لے آئے (۲) بغیر واسطے کے وسوسہ کو دور کرنا چاہتے ہیں (۳) اس میں خود وسوسہ کی طرف متوجہ ہوگیا خواہ اس کو دور کرنے کی بنا پر ہی ہوا ہو (۴) دور ہونا۔

طرف ایک دم سے متوجہ ہو کیونکہ نماز مرکب ہے مختلف اجزا سے۔ پس اس کی طرف توجہ اس طرح ہوگی کہ اس کے تمام اجزا کی طرف توجہ ہو مگر اس میں یہ خرابی ہے کہ بہت سے اجزا کی طرف توجہ کرنے سے قلب میں تشویش ہوگی۔ اس لئے یہ صورت تو ٹھیک نہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ جس جزو میں مشغول ہو اسی کی طرف توجہ رکھے۔ اس کا طریقہ ایک بزرگ نے بتلایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مثلاً سبحانك اللهم یاد سے مت پڑھو کہ رٹا ہوا ہونے کی وجہ سے زبان سے خود نکلتا چلا جائے۔ بلکہ ہر ہر جزو سوچ کر پڑھو کہ اب سبحانك اللهم کہہ رہا ہوں اب تبارك اسمك پڑھتا ہوں۔ اب لا اله غيرك نکالتا ہوں۔ اب بسم لله اب الحمد لله علی ہذا۔ ہر ہر لفظ کو ارادہ سے ادا کرو۔ جب قلب افکار کی طرف متوجہ رہے گا تو وساوس کی طرف توجہ نہ رہے گی۔ کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے۔ النفس لا تتوجه الی شیئین فی ان واحد۔ اس طریقہ سے اول ہی دن خشوع ہو جائے گا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اول اول نماز میں تنگی ہوگی۔ کیونکہ خیالات پریشان ہوں گے ان سے توجہ ہٹا کر ذکر کی طرف توجہ کرنی پڑے گی اس وجہ سے حقیقت کو گرانی ہوگی۔ اور بعض کو بآسانی بھی خشوع میسر ہو جائے گا۔

جب یہ تدبیر وساوس سے نجات کی ملی تو اب ایک اور آفت میں مبتلا ہوگا وہ یہ کہ یوں خیال کرے گا کہ طریقہ تو مل ہی گیا۔ بس جب چاہیں گے کر لیں گے اس لئے اول تو کرتے نہیں اور اگر کرتے ہیں تو ہمیشہ نہیں کرتے۔ مشائخ تک اس میں مبتلا ہیں اور یہ حالت ہے۔

واعظاں کیں جلوہ برمحراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می رسند آن کار دیگر میکنند
مشکلے دارم زدانش مند مجلس باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

''واعظین محراب ومنبر پر جلوہ کرتے ہیں اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں تو وہ دوسرے کام کرتے ہیں۔ مجھے یہ مشکل درپیش ہے کہ مجلس کے دانشمندان یہ سوال کرتے ہیں کہ دوسروں کو توبہ کی تلقین کرنے والے خود توبہ کیوں نہیں کرتے''

اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی طبیب ناز کرے کہ مجھ کو خارش کا نسخہ بڑا مجرب معلوم ہے مگر ساری عمر خارش میں مبتلا رہ کر مرجائے اور اس کا استعمال نہ کرے۔ سو اس کو نسخہ سے کیا فائدہ ہو۔ کوئی انجان کسی بات سے محروم ہے تو ایسی مصیبت نہیں جیسے کوئی جان بوجھ کر محروم رہے اسی کے بارے میں کہتے ہیں ؎

فان کنت لا تدری فتلك مصیبة وان کنت تدری فالمصیبة اعظم

''اگر تجھے اس کا علم نہیں تو یہ مصیبت ہے اور اگر تجھے اس کا علم ہے تو یہ بڑی مصیبت ہے''

اس تدبیر کے ملنے کے بعد شیطان دو طریقہ سے دھوکا دے گا۔ ایک تو یہ کہ ہر ہر لفظ پر توجہ کرنے سے شروع میں دل تنگ ہوگا۔ پس شیطان بہکائے گا کہ یہ تدبیر تو بہت مشکل ہے۔ تیرے بس کی نہیں ہے۔ اور ایک اس طرح کہ یہ سمجھائے گا کہ طریقہ تو معلوم ہو ہی گیا ہے جب جی چاہے گا اس سے علاج کرلیں گے۔ مگر خوب سمجھ لو کہ کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔ دو چار دن اس طریقہ سے نماز پڑھنے میں طبیعت زچ بچ رہے گی (۱) مگر پھر یہی قرۃ عینی فی الصلوٰۃ (۲) کی لذت وراحت میسر ہوگی۔ اس کا ترک برا معلوم ہوگا۔

حاصل یہ کہ خشوع کے حاصل کرنے کی یہ صورت ہے۔ پس جب خشوع حاصل ہوجائے گا تو پھر نماز میں کچھ گرانی نہ رہے گی۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ﴿اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ﴾ کہ نماز بھاری ہے مگر خاشعین پر بھاری نہیں۔ پھر اس کی نماز ایسی

(۱) طبیعت اکتائے گی (۲) میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے

ہوگی جس کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾ نیچے کو گرو (یعنی سجدہ کرو) اور قریب ہو جاؤ (آیت سجدہ) (۱)۔

سجدہ کی حقیقت

بلندی والوں سے تو قرب ہوتا ہے ترفع سے اور یہاں قرب ہوتا ہے پستی سے ؎

قرب تر پستی بہ بالا اختن است قرب حق از قید ہستی رستن است

''قرب اس کا نام نہیں کہ نیچے سے اوپر چلے جاؤ بلکہ قرب یہ ہے کہ ہستی سے چھوٹ جاؤ''

بس ان کے قرب کا یہی طریقہ ہے کہ پستی فنا حاصل کرلو اور سجدہ کی حقیقت یہی فنا اور نیاز مندی ہے۔ اس لئے وہ سبب ہے قرب کا۔ خلاصہ یہ کہ اول اول تو قیدیں بری معلوم ہوں گی۔ مگر پھر یہ قیدیں ایسی ہوں گی جیسا کہ شیخ شیرازی m فرماتے ہیں۔

اسیرش نخواہد رہائی زبند شکارش نجوید خلاص از کمند

''تیرا قیدی قید سے رہائی حاصل کرنا نہیں چاہتا اور تیرا شکار کمند سے خلاصی نہیں چاہتا''

چند روز ایسا کر کے اس کا مشاہدہ کرلو۔ اویس قرنی ہیں یا اور کوئی بزرگ ہیں ان کی یہ حالت تھی کہ ساری رات دو رکعت میں ختم کر دیتے ہیں یہاں تک کہ صبح ہو جاتی ہر رات کو ایک ایک رکن کے لئے مقرر کر لیتے۔ ایک دن فرماتے ہیں لیلۃ القیام (۱) دوسرے دن فرماتے ہیں لیلۃ الرکوع (۲) اور اس رات کے اکثر حصہ میں اسی رکن کے اندر مشغول رہتے اور جب تھوڑی رات رہ جاتی تو بقیہ ارکان

(۱) اس آیت کے پڑھنے پر سجدہ تلاوت واجب ہو گیا اس لئے پڑھنے والے سجدہ تلاوت کرلیں۔ (۱) قیام کی رات (۲) رکوع کی رات۔

پورا کر لیتے اور کہتے افسوس کہ مجھے دل بھر کر نماز پڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ کاش کہ ایک رات ایسی ہوتی کہ اسکا ایک سرا ازل سے ملا ہوا ہوتا اور دوسرا ابد سے اور اس میں ارمان پورا کرتا آپ کو اس پر تعجب ہوگا مگر عشاق کی شان ہی جدا ہے۔ ان کا تو کبھی دل ہی نہیں بھرتا ان کی تو یہ حالت ہوتی ہے ۔

نگویم کہ برآب قادر نیند کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

میں یہ نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں، لب دریا ہوتے ہوئے جلندھر کے بیمار کی طرح پیاسے ہیں'' اور یہ حالت ہوتی ہے۔

دلآرام دربر دلآرام جو لب از تشنگی خشک و برطرف جو

''محبوب سے ہم کنار اور محبوب کی تلاش، پیاس سے ہونٹ خشک اور لب دریا سیرابی کے طلب گار''

اس وقت یہ قیود زلف یار کی قیود ہو جائیں گے جس کی یہ حالت ہے'

گر دو صد زنجیر آری بکسلم غیر زلف آں نگار مقبلم

''اگر دو سو زنجیریں ہوں تو توڑ دوں، سوائے اپنے محبوب کی زلف کے بندش کے یعنی سوائے اپنے محبوب کے کسی اور کا گرفتار ہونا برداشت نہیں۔۔

اب تو قیدیں نظر آتی ہیں مگر پھر یہ قیود زلف یار کی قیدیں ہوں گی کہ کبھی ان سے نکلنا نہ چاہے گا۔

خلوت بالمحبوب

سچ کہتا ہوں کہ جو محبّ ہوگا وہ تو یہ چاہے گا کہ خلوت ہو اور محبوب کے ساتھ بے تکلف باتیں کرنا شروع کر دے گو ساری رات کیوں نہ گزر جائے۔ سو وہ خلوت یہی نماز ہے۔ واقعی اگر نماز نہ ہوتی تو جن کے واقعات بڑھے ہوئے ہیں

ان کے لئے کوئی خلوت کی صورت نہ تھی۔ کیونکہ اور تمام عبادات میں بولنا تو ضروری جائز ہے اس لئے ان میں لوگ اس سے بولنے چالنے سے بند نہ ہوتے اور نماز میں ہے اس کی ممانعت۔ اس لئے جہاں نماز شروع کی اور تمام لوگ اس سے بات چیت کرنے سے بند۔ لیجئے نماز میں حق تعالیٰ کے ساتھ خلوت میسر ہوگئی اور یہ خلوت وہ چیز ہے جس کی نسبت مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

''کوئی گوشہ بے دوڑ ودھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے سوائے خلوت گاہ حق (کہیں) آرام نہیں ہے''

نماز ہی کیا پاکیزہ چیز ہے کہ اس کی وجہ سے خلوت میسر ہوگئی اور جو قیود گراں تھیں انہی کی بدولت آسان ہوگئی اور خلوت بھی ایسی کہ اس کے اندر کوئی بھی حارج ہی نہیں ہوسکتا۔ جب نماز شروع کردی پھر بادشاہ بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر سورۂ بقرۃ بھی پڑھو تب بھی کوئی تقاضا نہیں کرسکتا۔ جب نیت باندھ لی اور سب کو ہرادیا۔ ہاں کوئی ظالم ظلم ہی کرنے لگے تو جدا بات ہے۔ ایسی آسان صورت ہے خلوت کی کہ جب کسی سے جی گھبرائے بس اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لو۔ نمازی کا کوئی کیا کرے گا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ دوست مذاق میں گدگدی اٹھاتے ہیں مگر جب نماز شروع کردی تو سب الگ بیٹھ جاتے ہیں یہ کاہے کی بدولت ہوا۔ قیود کی بدولت۔ اگر قیود نہ ہوتیں تو لوگ کہتے کہ میاں نماز بھی پڑھو اور باتیں بھی کرو۔ آپ نے دیکھا کہ یہ قیود کیسی قدر کی چیز ہیں اس لئے اہل محبت اس قید کو زلف یار کی قید سمجھتے ہیں کیونکہ یہ خلوت بالمحبوب (۱) قیود ہی سے تو میسر ہوئی ہے۔

کیرانہ میں میرے عزیزوں میں ایک درویش تھے۔ وہ خلوت کے لئے

(۱) محبوب کے ساتھ تنہائی ان قیدوں ہی کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔

دروازہ پر پہرہ چوکی رکھتے نہ تھے کہ یہ لوگوں کو ناگوارا ہوتا ہے بلکہ تخلیہ کی(۱) یہ صورت اختیار کی تھی کہ بیٹھک میں عام منظر پر بیٹھتے مگر ہر وقت نفل پڑھتے تھے۔ اگر کوئی ملنے آیا تو سلام پھیر کر اس کا مزاج پوچھا اور پھر نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ پھر سلام پھیر کر دو چار باتیں کیں اور پھر اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لی خلوت در انجمن اسی کو کہتے ہیں۔ غرض کہ خلوت کی خلوت تھی اور کوئی برا بھی نہیں مانتا تھا۔

سو یہ نماز ایسی چیز ہے کہ جس وقت خلوت چاہو نماز شروع کر دو بس خلوت ہو جائے گی۔ تو گویا نماز خلوت گاہ حق ہے(۲)۔ سو یہ کس وجہ سے خلوت گاہ حق بنی، قیود ہی کی بدولت تو بنی۔ ان قیود سے معلوم ہو گیا کہ نماز میں بہت بڑا روزہ ہے غرض نماز میں روزہ بھی پایا گیا۔

نماز میں حج

اسی طرح نماز میں حج بھی موجود ہے۔ کیونکہ حج کی حقیقت ہے تعلق بالبیت(۳)۔ سو نماز میں وہ موجود ہے۔ چنانچہ حکم ہے: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ کہ نماز کے وقت، بیت الحرام کی جانب قصد کر کے رخ کر لیا کرو۔

سو تعلق بالبیت نماز کے اندر قلب میں بھی ہے اور ظاہر میں بھی ظاہر میں تو یہ کہ نماز کی حالت میں اسی کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوتے ہیں اور اس کو فرض کر دیا گیا ہے۔ اور قلب میں یہ کہ استقبال کعبہ(۴) کی نیت کی جاتی ہے۔ پس جو نماز پڑھے گا اسے برکات حج بھی میسر ہوں گے۔

اسی طرح نماز میں اعتکاف بھی ہے کیونکہ اعتکاف کی روح وحقیقت ہے

(۱) تنہائی کے لئے (۲) نماز اللہ سے تنہائی میں باتیں کرنے کا نام ہے (۳) بیت اللہ کے تعلق (۴) کعبہ کی طرف منہ کرنے کی نیت کی جاتی ہے۔

گناہوں سے رکنا المعتکف یعتکف الذنوب کلھا[1] حدیث ہے اور یہ (خصوصیت) نماز کے اندر موجود ہے۔ چنانچہ نماز کے اندر تمام گناہوں سے رکتا ہے۔ نماز میں کون گناہ کرسکتا ہے ان الصلوٰۃ تنھی کی بعض نے یہی تفسیر کی ہے کہ نمازی جب تک نماز میں رہتا ہے اس وقت تک وہ اس کو گناہوں سے روکتی ہے۔ گو اس کی اور تفسیریں بھی ہیں مگر یہ بھی ایک لطیف تفسیر ہے۔ تلاوت قرآن بھی نماز میں موجود ہے جس کے حدیث میں بہت فضائل آئے۔ چنانچہ قرأت نماز میں فرض ہے بدون قرأت نماز ہی نہیں ہوتی۔

نماز کی جامعیت

پس جو شخص نماز پڑھے گا اس کو تلاوت قرآن کے فضائل بھی حاصل ہوں گے۔ خیال تو کیجئے کہ ذرا سی مختصر چیز میں کیا کیا فضائل مل گئے۔ حج بھی مل گیا، روزہ بھی مل گیا۔ تلاوت قرآن بھی اور اعتکاف بھی۔

بعض اذکار کی فضیلت احادیث میں آئی ہے جیسے سبحان اللہ کہ اس کے بارے میں آیا ہے کہ سبحان اللہ نصف میزان ہے نماز میں وہ بھی موجود ہے چنانچہ رکوع میں پڑھتے ہیں۔ سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ احادیث میں دعا کے بہت فضائل وارد ہیں اور قرآن میں کہیں کہیں اور خصوص فاتحہ میں تو ہر رکعت میں دعا بھی موجود ہے اور وہ نماز میں پڑھا ہی جاتا ہے۔ نیز درود شریف کے بعد بھی دعا کی جاتی ہے۔ پس نماز میں دعا کے فضائل بھی آگئے۔ درود شریف کے کتنے فضائل ہیں وہ بھی نماز میں پڑھا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ نمازی کسی برکت سے خالی نہیں۔ دعا ہے وہ اس میں موجود ثنا ہے وہ اس میں موجود، ذکر مبارک ہے وہ اس میں موجود۔ بعض لوگ اولیاء اللہ کا دم

(۱) معتکف سب گناہوں سے بچ جاتا ہے۔

بھرتے ہیں اور ان کے تذکرے کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ سو ان کا تذکرہ بھی نماز میں موجود ہے۔ چنانچہ ہر رکعت میں پڑھتے ہیں۔ اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ اس میں اولیاء اللہ بھی تو آ گئے۔

اب زکوٰۃ رہ گئی۔ شاید کوئی کہے کہ نماز میں زکوٰۃ کہاں ہے۔ سو سمجھ لیجئے کہ زکوٰۃ کی روح ہے انفاق فی سبیل اللّٰہ۔ ظاہر ہے کہ نماز ننگے تو پڑھو گے نہیں۔ کپڑا تو پہنو ہی گے اور اس میں خرچ بھی ہو ہی گا (خصوصاً) اس زمانہ میں کہ کپڑے کی بہت زیادہ قیمت ہوگئی ہے) لہٰذا انفاق بھی ہو گیا۔ اب کون سی عبادت رہ گئی جو نماز میں نہیں۔

شاید کوئی کہنے لگے کہ نماز میں قربانی نہیں تو سمجھ لیجئے کہ قربانی کی حقیقت باطنی ہے۔ اپنے کو فنا کر دینا اور اپنی خواہشات کو مٹا دینا۔ سو وہ نماز میں ایسی ہے کہ اپنے نفس سے پوچھو کہ قیود کے اندر مقید ہو کر اپنی خواہشات کو چھوڑنا پڑتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

معنی تکبیر ایں است اے ایم — کاے خدا پیش تو ما قربان شدیم
وقت ذبح اللہ اکبر مے کنی — ہم چنیں درذبح نفس کشتنی
گوئی اللہ اکبر وایں شوم را — سر ببر تا وارہد جاں ازغنا
تن چوں اسمعیلؑ جاں ہمچو خلیلؑ — کردجاں تکبیر برجسم بنیل

''تکبیر کی حقیقت یہ ہے کہ اے اللہ ہم تمہارے سامنے قربان ہوتے ہیں ذبح کے وقت تو تکبیر کہتا ہے ایسے ذبح نفس کے وقت جو مارنے کے لائق ہے اللہ اکبر ہو اور اس منحوس کا سر کاٹ مارو اور جان کو تکلیف سے رہائی دو۔ مثل تن حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اور جان مانند خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تکبیر

بزرگِ جسم مانند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اپنا سر اس محبوب حقیقی کے سامنے رکھ اور ہنسی خوشی اس کی تلوار کے سامنے جان دے اور اللہ کی بڑائی بیان کر"

غرض کون سی عبادت ہے جو نماز میں نہیں۔

نماز کا وقفہ

پھر یہ کہ چار منٹ میں سب باتیں ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ تخمیناً چار منٹ میں نماز ہوجاتی ہے۔ اول تو نماز ویسے ہی تھوڑی دیر میں ہوجاتی ہے اور اس پر لوگ اور زیادتی کرتے ہیں کہ جلدی جلدی پڑھتے ہیں۔

اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ کچہری میں دو ملازم تھے۔ ایک انگریز کی ماتحتی میں۔ ایک تو سررشتہ دار تھے اور دوسرا نائب سررشتہ دار۔ دونوں مسجد میں نماز پڑھنے جاتے۔ نائب سررشتہ دار کو نماز میں بہت دیر لگتی وظیفہ وظائف سے فارغ ہوکر آتے اور سررشتہ دار صاحب الٹی سیدھی ٹکریں مار کر اور کبھی بے پڑھے ہی فوراً چلے آتے۔ ایک روز انگریز نے کہا کہ سررشتہ دار صاحب تم بہت ہی جلد واپس آجاتے ہو۔ نائب دیر میں آتا ہے۔ یہ کیا بات ہے اس نے جواب دیا، حضور بات یہ ہے کہ نائب سررشتہ دار صاحب نے تو نماز خود اپنی ذات سے سیکھی ہے۔ اس لئے ان کو اچھی طرح یاد نہیں۔ سوچ سوچ کر پڑھتے ہیں اور میرے بڑوں سے نماز چلی آئی ہے۔ مجھ کو خوب مشق ہے اور خوب یاد ہے اس لئے میں جلد پڑھ کر آجاتا ہوں اور وہ اٹک اٹک کر پڑھتے ہیں اس لئے دیر لگتی ہے۔

غرض بعض کو نماز کی مشق ہوتی ہے کہ انہیں نماز کے شروع کرنے کی تو ضرورت ہوتی ہے پھر انہیں کسی بات کے قصد (۱) کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

(۱) ارادہ۔

زبان خود بخود چلتی رہتی ہے جیسے کہ گھڑی کہ اسے کوک (چابی) دینے کی تو ضرورت ہوتی ہے۔ پھر وہ خود بخود چلتی رہتی ہے۔ اسیطرح اللہ اکبر پر تو کوک شروع ہوئی اور سلام پر ختم۔ اگر نماز اس طرح پڑھی جائے تو چار منٹ سے بھی کم لگتے ہیں۔

ایک آقا اور نوکر تھے۔ وہ نماز پڑھنے آتے تو آپس میں بحث ہوتی کہ پہلے کون فارغ ہو۔ نماز شروع کرتے اور ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی کہ پہلے میں فارغ ہوں۔ بس ادھر اللہ اکبر کہتے اور ادھر نماز ختم ہو جاتی۔ ایک شخص نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اذکار تو گھر کر آتے ہو اور اٹھک بیٹھک کرنا باقی رہ جاتا ہے وہ یہاں آکر بولتے ہو۔

اس پہلے فارغ ہونے پر ایک قصہ ایک ہوشیاروں کے قصبہ کا یاد آیا۔ عید کی امامت میں دو شخصوں میں تنازعہ ہوا۔ اس نے کہا کہ نماز میں پڑھاؤں گا اس نے کہا میں پڑھاؤں گا۔ آخر عین وقت پر دونوں نے یک دم سے امامت شروع کر دی۔ کچھ ان کے مقتدی ہو گئے کچھ ان کے۔ ایک پہلے الحمدللہ پڑھ چکے اور ابھی دوسرے نے ختم نہیں کی تھی۔ جس نے پہلے ختم کی تھی وہ ٹھہر گئے۔ اس خیال سے کہ جونسی سورۃ یہ پڑھے گا میں اس سے چھوٹی سورۃ پڑھ کر پہلے ختم کر دوں گا اور میر بنوں گا[1]۔ لہذا اس نے جو سورۃ پڑھی اس نے اس سے چھوٹی سورت پڑھ کر اللہ اکبر کہہ کر رکوع کر دیا مقتدی دوسرے امام کے بھی رکوع میں گئے۔ بس اس جماعت کے ایک مقتدی نے اپنے پاس والے کے کہنی ماری اور کہا اونہہ۔ مطلب یہ تھا کہ یہ ہمارا امام نہیں تو رکوع میں کیوں جاتا ہے۔

اس قسم کی حکایات پر ہمیں ہنسی آتی ہے مگر ہم خود اس کے عامل ہیں۔ یہی چاہتے ہیں کہ نماز جلدی ختم ہو۔ سوائے اِنَّا اَعْطَیْنَا اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ کے ہمیں اور

(۱) یعنی سردار بنوں گا۔

کوئی سورۃ ہی یاد نہیں۔ ہاں اگر سلطنت مل جائے یعنی امامت تو پھر دیکھو کیسی لمبی سورتیں پڑھتے ہیں کہ مقتدی بھی کھڑے کھڑے وبال میں آجائیں۔

کانپور کا واقعہ ہے ایک صاحب امام ہوئے۔ خوب گرمی کا زمانہ تھا۔ جمعہ کا روز۔ انہوں نے سورۃ ق پڑھی۔ کھڑے کھڑے ایک نمازی کو توتے ہوگئی۔ ایک بیچارہ نے اسی روز نماز شروع کی تھی۔ لوگ اسے کہہ سن کر نماز کیلئے لائے تھے جب انہوں نے لمبی لمبی سورتیں پڑھنی شروع کیں تو وہ نیت توڑ کر یہ کہتے ہوئے چلتا بنا اور کہا کہ ہم اسی واسطے تو نماز نہیں پڑھتے۔ اس قسم کے لوگ مناع خیر ہیں(۱)۔ حدیث میں مقتدیوں کی بڑی رعایت آئی ہے۔ غرض کہ جب امام ہوتے ہیں تو اس وقت تو ایسی نماز پڑھتے ہیں اور جب تنہا پڑھتے ہیں تو ایسی کہ قفال مَرْوَزِی نے پڑھی تھی۔

قصہ اس کا یہ ہے کہ اس نے بادشاہ کو حنفیہ سے بدگمان کرنے کے لئے کہا کہ میں آپ کو حنفیوں کی نماز پڑھ کر دکھلاؤں گا۔ پس اس نے چھوٹی سی تہد باندھی کہ ناف تو کھلی رہی اور گھٹنے ڈھک گئے اور اللہ بزرگ است کہہ کر نماز شروع کی اور برگ سمبز کہہ کر رکوع کر دیا اور رکوع میں جاتے ہی بلا تسبیح کہے سیدھے سجدہ میں چلے گئے۔ اسی طرح تمام نماز پڑھی اور قعدہ اخیرہ تشہد پڑھ چکے تو بجائے سلام کے زور سے ایک گوز رسید کیا۔(۲)

اس نے تمسخر سے نقل کی تھی باقی ہماری اصل نماز بھی ایسی ہی ہے نہ تعدیل ارکان کرتے ہیں نہ اس کا اور کوئی حق ادا کرتے ہیں۔ بس جلدی اتنی ہوتی ہے کہ کچھ ٹھیک نہیں۔ ادھر اللہ اکبر کہا ادھر ختم۔ میں کہتا ہوں کہ اگر سنبھال کر پڑھیں تو بھی چار منٹ صرف ہوتے ہیں۔ پھر اور جلدی کرنے کی کیا ضرورت

(۱) خیر سے روکنے والے ہیں (۲) پاد مار دیا۔

ہے۔ چار منٹ کی تو بات ہے۔ اتنی دیر میں ثواب کے ڈھیر کے ڈھیر لے کر چلے آؤ گے ۔

خود کہ یا بی ایں چنیں بازار را کہ بیک گل مے خری گلزار را
نیم جاں بستاندہ وصدجاں دہد آنچہ درو ہمت نیاید آن دہد

'' ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے کہ ایک پھول کے بدلے میں چمن ہی خرید لے۔ حقیر وفانی جان لیتے ہیں اور باقی جان عطا فرماتے ہیں۔ تمہارے وہم و گمان میں نہیں آسکتا جو کچھ عطا فرماتے ہیں'

چار منٹ میں اتنی دولت! افسوس ہے کہ اس پر بھی ہمارے بھائی نماز پڑھنے میں پس وپیش کرتے ہیں اور اور حالت یہ ہے کہ چوپالوں(۱) میں باتیں گھڑتے رہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ مسجد میں باتوں ہی کے واسطے چلے آیا کرو۔ پھر اس کی اصلاح بھی ہوجائے گی۔ آؤ تو سہی۔

بہر حال نماز کی ہیئت بتلارہی ہے کہ نماز تمام عبادات میں ممتاز ہے۔ اپنے باطن سے بھی کہ اس کے اندر تمام عبادات موجود ہیں اور اپنے ظاہر سے بھی کہ جیسے نماز کی ہیئت خشوع وخضوع کی ہے اور کسی عبادت کی نہیں۔ اسی طرح ذکر میں۔

نماز کی صورت

ذکر میں جتنے منافع ہیں وہ بھی نماز میں ہیں۔ کیونکہ ہر عمل کی ایک ہیئت ہوتی ہے اور ایک روح اور ضروری دونوں ہی ہوتی ہیں۔ سو نماز کی روح ذکر ہے چنانچہ ارشاد فرمایا۔ اقم الصلوٰۃ لذکری کہ میری یاد کرنے کے لئے نماز پڑھا کیجئے۔

(۱) عام بیٹھکوں میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے ہیں۔

پس جو منافع ذکر کے ہوں گے۔ نماز میں وہ بھی ہوں گے۔ بس نماز تمام فضائل کی جامع ہوئی اپنے ان اسرار کے بیان کرنے پر اس وقت کے مناسب ایک کام کی بات یاد آئی۔ وہ یہ کہ اس زمانہ میں بعض لوگوں نے ہر چیز کے اسرار ایسے طور پر بیان کرنے شروع کئے ہیں کہ گویا اس عمل سے مقصود ہی سر اور راز ہے۔ سمجھ لیجئے کہ اگر یہی طرز رہا تو شاید چند روز میں الحاد تک نوبت آجائے۔ کیونکہ جب ہر عمل کے اسرار اور ارواح بطور مقصود کے بیان کئے جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صرف ارواح کو ضروری سمجھیں گے اور صورت کی طرف سے بے اعتنائی(۱) ہوجائے گی اور اس سے اندیشہ ہے کہ عبادت کی صورت نہ چھوٹ جائے۔ کیونکہ جب کہ ان کے نزدیک عبادت کی روح تو ضروری ہوگی اور اس کی صورت ضروری نہ ہوگی تو اس صورت کی قید کو حذف کردیں گے اور مطلق ذکر پر اکتفا کریں گے مثلاً نماز کہ اس کی ہیئت کو چھوڑ دیں گے اور مطلق ذکر پر اکتفا کریں گے۔

چنانچہ آج کل ایک راز اور برکت نماز کی یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ جماعت کی نماز سے اتفاق ہوتا ہے اور اس کی یہ ترتیب بتلائی جاتی ہے کہ پانچوں نمازوں میں تو محلّہ کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ پھر جمعہ میں شہر کے لوگ۔ پھر اس کی ضرورت ہے کہ دیہات کے لوگ جمع ہوں اس کے لئے عید ہے۔ پھر ضرورت ہے کہ مختلف ولایتوں کے لوگ جمع ہوں اس کے لئے حج تجویز کیا۔ پس یہ عبادات ایسی چیز ہیں کہ ان میں اتفاق کی رعایت رکھی گئی ہے۔

یہ عنوان تو بہت اچھا ہے اور بہت خوب صورت ہے مگر اس کا خلاصہ یہ

---

(۱) لاپرواہی۔

نکلتا ہے کہ عبادات بنفسہا مقصود نہیں بلکہ بمصالحہا(۱) مقصود ہیں۔ اس کا مآل(۲) کسی وقت میں یہ ہوگا کہ اگر اغراض بدون ذرائع کے حاصل ہوجائیں گی تو نفس کہے گا کہ مقصود تو حاصل ہو ہی گیا۔ اب ان اعمال کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے الحاد کا باب کھلتا ہے۔ یہ باتیں عوام الناس کے سامنے ہرگز نہ بیان کی جائیں اور اگر بیان کریں بھی تو کہہ دیں کہ عبادات تو بنفسہا ہی مقصود ہیں۔ ہاں ان سے یہ مصالح بھی حاصل ہوتے ہیں جیسے کوئی حج کی ترغیب دے اور کہے کہ حج کرنے سے ایسے ایسے منافع حاصل ہوتے ہیں کہ مکہ کی سیر ہوتی ہے۔ دریا پہاڑ، شہر دیکھنے میں آتے ہیں مگر یہ چیزیں مقصود نہیں ہیں۔ مقصود اصلی رضا حق ہے۔ ہاں اس سے یہ منافع بھی حاصل ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح اعمال پر جو مصالح مرتب ہوتے ہیں وہ مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بنفسہا یہی اعمال ہیں خواہ یہ مصالح نہ بھی مرتب ہوں۔

نماز کی روح

بیان یہ ہورہا تھا کہ ذکر نماز کی روح ہے۔ درمیان میں ایک کام کی بات بھی بیان کردی اور چونکہ ذکر نماز کی روح ہے اسی واسطے نماز کی فضیلت کے موکد کے لئے فرماتے ہیں۔

وَلَذِکْرُاللّٰہُ اَکْبَرُ کہ اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے۔

اس لئے نماز میں اگر یہ خاصیت ہو کہ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ ''برائیوں سے روکتی ہے'' تو تعجب کی بات نہیں ہے بعض لوگ یہ کہنے لگے کہ ذکر بڑھ کر ہے یعنی نماز سے بھی۔ پس ذکر ہی کرلیا کریں نماز نہ پڑھیں۔

اس کا ایک لطیف جواب میرے عرض سابق سے نکل آیا یعنی وَلَذِکْرُاللّٰہُ

(۱) عبادت اپنی ذات سے مقصود نہیں بلکہ مصلحتوں کی وجہ سے مقصود ہے (۲) انجام۔

اَکْبَرُ ۔ ''اور اللہ کی یاد بڑی چیز ہے'' اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذکر اللہ نماز سے بڑھ کر ہے بلکہ یہ علت ہے ماقبل کی۔ پہلے نماز کی ایک خوبی بیان کی ہے اب آگے اس کی علت بتلاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ نماز کی یہ خاصیت ہے کہ وہ برائیوں سے روکتی ہے۔ مگر یہ خاصیت اس کی کیوں ہوئی اس لئے ہوئی کہ وَلَذِکْرُاللّٰہُ اَکْبَرُ ''اس کی روح ہے ذکر اللہ اور'' اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے اور ہر پہلو سے مفید ہے طبع سے، عقل سے، عشق سے۔ عشاق کی نظر تو بس اس خاصیت پر ہے۔ ان ذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسی وان ذکرنی فی ملاء ذکرته فی ملأخیر منهم۔

یعنی جو دل میں یاد کرتا ہے تو خدا اس کو دل میں یاد کرتے ہیں (خدا دل سے پاک ہے مگر صرف شاکلۃً ایسا فرمادیا) جو مجمع میں یاد کرے تو حق تعالیٰ اس کو مجمع میں یاد کرتے ہیں۔

گویا ذکر کرنے سے حق تعالیٰ کے مذکور بنے۔ عاشق کے لئے کون سی دولت اس سے زیادہ ہوگی کہ اس کا محبوب اس کو یاد کرے۔ اول تو عاشق کو محبوب کا نام لینا ہی نہایت پیارا معلوم ہوتا ہے اور پھر اس کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں کہ محبوب اس کا نام لے۔

یہاں سے ایک بڑی بشارت معلوم ہوئی کہ جیسے ہم خدا تعالیٰ کو چاہتے ہیں ایسے ہی وہ بھی ہم کو چاہتے ہیں۔ مگر ان کے چاہنے کا بظاہر اعلان نہیں ہوتا۔ اخبار و آثار سے معلوم ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق معشوقاں نہاں است وستیز عشق عاشق بادوصد طبل ونفیر
لیک عشق عاشقاں تن زہ کند عشق معشوقاں خوش و فربہ کند

''معشوقوں کا عشق پوشیدہ اور چھپا ہوا ہے، عاشق کا عشق دو سو طبل اور شہنائیوں کے ساتھ ظاہر و باہر ہے لیکن عاشقوں کا عشق دبلا کر دیتا ہے اور معشوق کا

عشق موٹا اور فربہ کر دیتا ہے''

سو جیسے عاشق معشوق کا طالب ہوتا ہے اسی طرح معشوق عاشق کا طالب ہوتا ہے ؎

تشنگاں گر آب جوئند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

''پیاسے اگر پانی کے متلاشی ہیں تو پانی بھی ان کا طالب ہے''

قرب خداوندی

بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کو بندہ سے جتنی محبت ہے اتنی بندہ کو حق تعالیٰ سے نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ محبت موقوف ہے معرفت پر اور ظاہر ہے کہ جیسی معرفت بندہ کی خدا کو ہے بندہ کو خدا کی نہیں۔ اور یہی معنی ہیں آیت ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ ''ہم اس کے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں'' کہ علماً و معرفتاً بندے ہم سے قریب ہیں ﴿تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ﴾ ''تمہارے جی میں جو وسوسہ آتا ہے ہم اس کو (بھی) جانتے ہیں'' اسی وجہ سے نحن اقرب فرمایا کہ ہم قریب ہیں انتم اقرب الینا نہیں فرمایا کہ تم بھی ہم سے قریب ہو۔ سو اس سے قرب حقیقی مراد ہوتا تو دونوں طرف سے قرب ہوتا کیونکہ یہ قرب نسب متکررہ سے ہے۔ اگر ایک طرف سے قرب ہوگا تو دوسری طرف سے بھی ضرور ہوگا۔

رہا قرب علمی سو اس میں یہ ضرور نہیں کہ اگر ایک طرف سے قرب ہو تو دوسری طرف سے بھی ہو۔ تو قرب علمی خدا کی طرف سے تو ہے۔ اس لئے کہ ان کا علم کامل ہے اور بندہ کی طرف سے نہیں کیونکہ بندہ ہے غافل۔ پس بندہ تو خدا سے دور ہوا اور اللہ تعالیٰ بندہ سے قریب۔ غرض حق تعالیٰ کو پوری معرفت ہے اور معرفت ہی پر مدار ہے محبت کا۔ اس لئے ان کو پوری محبت ہوگی ہم سے۔

اگر کوئی کہے کہ حق تعالیٰ کو بندہ کی معرفت ہوئی تو اس کے ساتھ اس کے

تمام عیوب کی بھی معرفت ہوئی۔ سو جس معرفت کے ساتھ عیوب کی بھی معرفت ہو تو وہ محبت کا سبب نہیں ہوسکتی۔ تو میں کہوں گا کہ یہ اس سے کہو جو صورت پر مرتا ہو۔ جو صورت کا عاشق ہوتا ہے عیوب پر مطلع ہونے سے اس کو محبت نہیں رہتی۔

اللہ کی محبت

حق تعالیٰ کو جو ہم سے محبت ہے تو وہ اس لئے نہیں کہ ہمارے اندر کوئی خوبی ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ہم ان کے بنائے ہوئے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ آپ نے اپنی قوم پر بددعا کی۔ قوم ہلاک ہوگئی۔ سب کچھ ہوجانے کے بعد حق تعالیٰ کا حکم ہوا کہ فلاں جگہ جا کر چالیس برس تک مٹی کے برتن بناؤ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد حکم ہوا کہ سب کو ایک طرف سے توڑ ڈالو۔ چنانچہ انہوں نے توڑنا شروع کیا مگر دل پر بہت صدمہ تھا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ توڑنے سے کچھ دل بھی دکھا۔ عرض کیا کہ دل تو بہت دکھا۔ ارشاد ہوا کہ بس ایسے ہی اپنی مخلوق کو ہلاک کرنا ہم کو ناگوار ہوگا جیسے برتن تمہارے بنائے ہوئے تھے اسی طرح بندے ہمارے بنائے ہوئے تھے۔

قارون کے قصہ میں دیکھئے کہ وہ تو کہہ رہا تھا کہ اے موسیٰ مجھ کو بچاؤ اور آپ فرماتے تھے خذ یا ارض کہ اے زمین اسکو پکڑ۔ یہاں تک کہ بالکل زمین میں دھنس گیا۔ حق تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہوا کہ اگر ہمیں ایک دفعہ بھی پکارتا تو ہم فوراً بچا لیتے۔

عتاب میں عنایت

سیر میں ہے کہ جب بندے گناہ کرتے ہیں تو زمین آسمان کہتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں حکم دے کہ ہم ان پر ٹوٹ پڑیں۔ اس پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

میرے بندوں کو تم نے تھوڑا ہی بنایا ہے۔ سو حق تعالیٰ کی بندوں سے اس قدر محبت ہے۔ حتی کہ حق تعالیٰ کے عتاب تک میں بھی عنایت ہوتی ہے چنانچہ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ ''اگر اللہ میاں لوگوں کے اعمال پر مواخذہ کرتے تو کسی جاندار کو زمین پر نہ چھوڑتے''

بظاہر یہ کلام بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ مقدم اور تالی میں بظاہر علاقہ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ظاہر تو ہے کہ یوں فرماتے: ولو یواخذ الله الناس بما کسبوا ما ترك علیهما من بشر ''کہ اگر آدمیوں سے مواخذہ فرماتے تو زمین پر کسی آدمی کو نہ چھوڑتے''۔

نہ یہ کہ مواخذہ تو صرف آدمیوں سے فرماتے اور ہلاک جانوروں کو بھی کر دیتے۔ بظاہر یہ بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ سو بات یہ ہے کہ عین عتاب میں بھی ان کا شرف بتلایا ہے کہ مقصود بالخلق انسان ہی ہے(۱) اور دوسری چیزیں اسی کے واسطے بنائی گئی ہیں تو اگر ان سے مواخذہ کرتے تو ان میں سے کسی کو نہ چھوڑتے اور جب ان کو نہ رکھتے تو جانور نرے کیا کرتے۔

کیا رحمت ہے کہ عتاب میں بھی ہمارا شرف بیان کیا جا رہا ہے کہ انسان ہی اشرف المخلوقات ہے حق تعالیٰ کا انعام دیکھئے کہ جوتیاں لگائیں مگر قدر و منزلت نہیں گھٹائی بھلا ایسا آقا مل سکتا ہے۔ ایسے آقا کا یہی ادب اور یہی معاملہ ہے جیسا ہم کر رہے ہیں۔

حق تعالیٰ کی رحمت

حق تعالیٰ کو محبت ہم سے اس حیثیت سے ہے کہ ہم اس کے بنائے ہوئے ہیں گو مطیع نہ ہوں(۱) اور جو اطاعت کرے اس کو پوچھنا ہی نہیں ان پر تو لحہ

(۱) ساری مخلوقات کو پیدا کرنے سے مقصود انسان کا پیدا کرنا ہی ہے(۱) اگرچہ فرمانبردار نہ ہوں۔۔

برلحہ فخر کرتے ہیں۔

اگر کوئی ذکر کا جلسہ ہوتا ہے مثل وعظ وغیرہ کے تو جب فرشتے یہاں سے لوٹ کر جاتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ میرے بندے کیا کررہے ہیں وہ عرض کرتے ہیں کہ آپ کی تسبیح اور تحمید کررہے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں فرشتے عرض کرتے ہیں جنت کو طلب کرتے ہیں اور دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ گواہ رہو میں نے سب کو بخش دیا۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ ان میں ایک شخص آپ کے ذکر کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ کسی کام کے لئے آیا تھا۔ اس کا مقصود اس جلسہ میں شرکت نہ تھی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کو بخش دیا۔ اس لئے کہ ھم قوم لا یشقی جلیسھم ''یہ ایسے لوگ ہیں جن کے ساتھ بیٹھنے والے محروم نہیں''

اب رہی یہ بات کہ بندوں کی حالت فرشتوں سے کیوں پوچھتے ہیں۔ انہیں تو ویسے ہی بدوں فرشتوں کے تمام باتوں کا علم ہے۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک دفعہ ہمارے متعلق ایک بات کہہ دی تھی جس سے اب تک ان کا پیچھا نہیں چھوٹا۔ سو ان سے پوچھ کر یہ جتلاتے ہیں کہ دیکھو یہ وہی تو ہیں جن کے بارے میں تم نے ایسا کہا تھا۔ فرشتوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ فرشتوں نے کہا تھا: اتجعل فیھا من یفسدفیھا کہ آپ زمین میں ایسے کو خلیفہ بناتے ہیں جو اس میں فساد کرے۔ ''من'' سے مراد عام تھا کہ وہ سب ایسے ہی ہوں گے۔ سو وہ موجبہ کلیہ کے مدعی تھے پس سالبۂ جزئیہ ان کے مقابلہ میں کافی ہوگیا (یعنی ایک ایسے شخص کا پیش کردینا جو مطیع کامل ہو ان کے موجبہ کلیہ توڑنے کے لئے کافی ہے۔ یہ نہیں کہ سارے مطیع ہوں تب ہی ان کا جواب ہوسکے، سو فرشتے ایک دفعہ

ہم پر اعتراض کرنے سے پکڑے گئے۔ آج تک ان کا پیچھا نہیں چھوٹتا۔ جب کوئی موقعہ ہوتا ہے تو حق تعالیٰ جتلا دیتے ہیں۔

اسی طرح فرشتوں کی بددلی ہوتی ہے عصر اور صبح میں۔ جو فرشتے عصر کے وقت آئے تھے وہ صبح کے وقت رخصت ہوتے ہیں اور ان کی بجائے دوسرے فرشتے آتے ہیں۔ پھر وہ عصر کے وقت چلے جاتے ہیں۔ اور دوسرے آجاتے ہیں۔ جب واپس ہوکر جاتے ہیں تو ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ہمارے بندے کیا کررہے تھے وہ عرض کرتے ہیں کہ یا الٰہی جب ہم گئے تھے جب بھی نماز پڑھ رہے تھے اور واپسی کے وقت بھی نماز پڑھتے چھوڑا اللہ میاں دونوں وقت فرشتوں کو جتلا دیتے ہیں اور بددلی بھی خاص اس وقت میں کرتے ہیں۔ جو ہنر کا وقت ہے۔ اور اسی وقت کی حالت پوچھتے ہیں کہ میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے۔ حالانکہ فرشتے دیکھتے سب ہیں جو کچھ بھی بندے کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی شان ہے یعلمون ما تفعلون ''جو تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں'' مگر ان سے صرف اسی وقت کی حالت پوچھتے ہیں۔ بلا پوچھے وہ خود کہہ نہیں سکتے۔ سو مطلب یہ ہوا کہ دیکھو سب کچھ مگر خوبی کے سوا اور کچھ مت کہو۔ صرف خوبی کی بات کہو برائی کی بات مت کہو۔

صاحبو! حق تعالیٰ کو اتنی محبت ہے بندوں سے اور بندے بیچارے کیا محبت کریں گے۔ اگر تم کو حق تعالیٰ سے محبت ہے تو یوں سمجھو کہ ادھر اس سے زیادہ محبت ہے۔ غرض کہ عشاق کے نزدیک تو ذکر کا یہی نفع ہی سب کچھ ہے کہ خدا تعالیٰ ہم کو یاد کریں۔ اور اگر سچ پوچھو ہم تو یاد کرنے کے قابل نہیں کیونکہ ان کا ذکر جتنے ادب سے ہونا چاہیے یہاں اس کا عشر عشیر بھی نہیں(۱)۔ بھلا حاکم دنیا کا نرا نام تو لو۔ کیا کچھ عتاب ہو کہ ہمارا نام لیتا ہے اور وہاں سے حکم ہے نام لینے کا۔ یہ کتنی بڑی

(۱) دسواں حصہ بھی نہیں۔

رحمت ہے۔ ہماری تو زبان بھی نام لینے کے قابل نہیں۔ ہماری زبان کیسی ہے ؎

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

ہم تو مشک وگلاب سے منہ کو صاف کریں تب بھی نام لینے کے قابل نہ ہوں مگر رحمت دیکھئے کہ پھر بھی ہمارے یاد کرنے پر وہ ہم کو یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿فاذکرونی اذکرکم﴾ ''پس تم مجھے یاد کرو۔ میں (اپنی عنایت سے) تمہیں یاد کروں گا'' اے صاحبو! محبوب کا محبّ کو یاد کرنا تھوڑی بات ہے ہمیں اس کی قدر نہیں۔

صحابہ j کی حالت دیکھئے۔ ایک دفعہ حضور ﷺ نے ابی ابن کعب h سے فرمایا کہ مجھ کو اللہ نے حکم کیا ہے تمہارے سامنے قرآن پڑھنے کا۔ اس پر ابی ابن کعب h نے کہا۔ اللّٰہ سمانی ۔کیا اللہ نے میرا نام لیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نعم! ہاں ! انہوں نے تمہارا نام لیا ہے۔ اس پر ابی ابن کعب h رونے لگے۔ محبوب کے نام لینے کی قدر ان حضرات کو تھی۔

کوئی کہے کہ یہ تو خوشی کا موقع تھا اس وقت رونا کیسا تو سمجھ لو کہ رونا ہمیشہ غم ہی کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ حضرت حاجی صاحب m فرمایا کرتے تھے کہ ایک رونا خوشی کا ہے اور ایک غم کا اور ایک رونا ہے گرم بازاری عشق کا تو یہ رونا عشق تھا۔ بہرحال نماز کی روح ہے ذکر اور ذکر کی خاصیت یہ ہے تو نماز کی بھی یہ خاصیت ہوئی۔

ذکر کی خاصیت

اس کے علاوہ ذکر کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ذاکر کو کوئی خطرہ اور پریشانی نہیں رہتی اور یہ بات عقل اور طبع دونوں اعتبار سے ہے۔ عقلاً تو اس لئے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ؎

فاذکرونی اذکرکم کہ تم اللہ کو یاد کرو وہ تمہیں یاد کریں گے۔

پس جب کوئی شخص خدا کی یاد کرے گا اس کے ساتھ یہ بھی سمجھے گا کہ خدا تعالیٰ مجھ کو یاد کرتے ہیں اور قاعدہ ہے کہ جب کسی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاکم ہمارا خیال رکھتا ہے تو پھر اس کو کچھ خطرہ نہیں رہتا۔ پس حق تعالیٰ کو یاد کرنے سے اس کو کسی قسم کا خطرہ نہ رہے گا۔

اور طبعاً اس لئے کہ یہ امر طبعی ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو یاد کرتا ہے تو اس کو اور ہر طرف سے یکسوئی ہوجاتی ہے۔ یعنی جس کو یاد کرتا ہے اس کے ساتھ کوئی چیز قلب میں جمع نہیں ہوتی۔ پس جب خدا تعالیٰ کو یاد کریں تو ان کے ساتھ یکسوئی ہوگی۔ یکسوئی ہوجانے سے پھر کسی (اور) طرف التفات نہیں ہوتا۔ اور پریشانی مختلف پہلوؤں پر التفات کرنے سے ہوتی ہے اس لئے ذکر سے کسی قسم کی پریشانی نہیں رہ سکتی اور میں اس پر قسم کھاتا ہوں اور گو یہ بات اپنے بزرگوں کی تقلید سے کہہ رہا ہوں کہ خدا کے یاد کرنے والے کے پاس دنیا کی نہ پریشانی ہے، نہ برزرخ کی نہ آخرت کی، نہ پل صراط کی۔ مگر میں اس کو سائنس کی رو سے سمجھائے دیتا ہوں۔

وہ یہ کہ قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کوئی چیز (ذہن میں) پائی جاتی ہے تو اس کا مقابل نہیں رہتا اور پریشانی مقابل ہے یکسوئی کی۔ پس جب یکسوئی آئی تو اس کا مقابل کہاں۔ پس جو شخص حق تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوگا وہ ہرگز پریشان نہیں ہوسکتا۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

''کوئی گوشہ بے دوڑ ودھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے، سوائے خلوت گاہ حق کے (کہیں) آرام نہیں ہے''

باقی اللہ کے سوائے جہاں بھی پناہ لوگے آفت سے چھٹکارہ نہ ہوگا

گرگریزی برامید راحتے ہم از آنجا پشت آید آفتے

''اگر کسی راحت یا آرام کی جگہ پر بھاگتا ہے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی''

پس جب سارے ٹھکانے ایسے اور ایک ایسا تو اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ اور ذکر کی اس خاصیت کا رات دن مشاہدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل اللہ کی حالت دیکھ لیجئے وہ فقر وفاقہ میں اور طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں واللہ تکلیف ان کے جسم تک محدود رہتی ہے۔ پریشانی جس کا نام ہے وہ کبھی نہیں ہوتی، اور وہ برزبان حال یہ کہتے ہیں ؎

کوئے نومیدی مرد کا مید ہاست سوئے تاریکی مرد خورشید ہاست

'' ناامیدی کی راہ نہ جاؤ، بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں''

پس جب سارے ٹھکانے ایسے اور ایک ٹھکانا ایسا تو اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ اور ذکر کی اس خاصیت کا رات دن مشاہدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل اللہ کی حالت دیکھ لیجئے وہ فقروفاقہ میں اور طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں واللہ تکلیف ان کے جسم تک محدود رہتی ہے۔ پریشانی جس کا نام ہے وہ کبھی نہیں ہوتی، اور وہ برزبان حال یہ کہتے ہیں ؎

کوئے نومیدی مرد کا میدہاست سوئے تاریکی مرد خورشید ہاست

'' ناامیدی کی راہ نہ جاؤ، بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں''

ایک راز اس کا کہ اہل اللہ کو پریشانی نہیں ہوتی یہ بھی ہے کہ یہ ہر واقعہ اللہ کی طرف سے سمجھتے ہیں اور اللہ سے ہے ان کی محبت۔ اس لئے جو بات بھی ان کو پیش آئے گی وہ اس کو محبوب کی طرف سے سمجھیں گے۔ جب یہ ہے تو پھر پریشانی کہاں۔ محبوب کی تو مار بھی ناگوار نہیں ہوتی۔

دیکھئے اگر کوئی عاشق چلا جارہا ہو اور محبوب پیچھے سے آکر اس کے زور سے دھول لگائے (۱) اور یہ پیچھے پھر کر دیکھے کہ میرا محبوب ہے تو خوشی میں آکر کہے گا او ہو آپ ہیں۔

اب تمنا ہوگی کہ ایک اور مارے۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس تکلیف کو راحت سے کس چیز نے مبدل کر دیا۔ بس انتساب الی المحبوب (۲) نے کہ وہ دھول چونکہ محبوب (۳) کا مارا ہوا ہے۔ اس لئے وہ راحت ہوگئی۔ اسی طرح مصائب میں اہل اللہ کی حالت ہوتی ہے چونکہ وہ محبوب کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں اور مصائب کو محبوب کی طرف سے سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کو اس سے عین راحت ہوتی ہے وہ تو برزبان حال یہ کہتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یاردل رنجان من (۱)

صبر کا طریقہ

یہی راز ہے اس کا کہ جب حضور ﷺ کو یہود کے اس قول سے بہت صدمہ ہوا کہ خدا آسمان پیدا کر کے تھک گیا تو اس نے یوم السبت (۲) میں آرام کیا۔ تو اس پر حق تعالیٰ نے پہلے ان کے قول کی تردید میں یہ آیت نازل کی ﴿وَلَقَدْ

(۱) ایک تھپڑ مارے (۲) محبوب کی طرف منسوب ہونے سے (۳) وہ تھپڑ محبوب کا مارا ہوا ہے (۱) ناپسندیدہ بات بھی اگر میری طرف سے ہو مجھے پسند ہے میرا دل تیری محبت میں گرفتار ہے وہ اس بات کو پسند کرتا ہے جو تجھے پسند ہو (۲) ہفتہ کے روز۔

خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ﴾ ''اور ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے ان سب کو چھ دن میں پیدا کیا اور ہم کو تھکان نے چھوا تک نہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہوا فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ ''پس ان کی بات پر صبر کیجئے'' مگر صبر کیسے کریں اتنے بڑے صدمہ پر تو آگے اس کی ترکیب بتلائی ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ﴾ ''اور اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے رہیے'' (اس میں نماز بھی داخل) سورج نکلنے سے پہلے (نماز فجر) اور چھپنے سے پہلے (ظہر وعصر) طریقہ صبر کا کیا ہے۔ وہ یہ کہ آؤ ہم سے باتیں کرنے کھڑے ہو جاؤ بس سب رنج وصدمہ جاتا رہے گا۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے رنج پہنچایا اور محبوب کہے کس جھگڑے میں پڑے ہو آؤ ہم سے باتیں کرلو۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس شخص کو صدمہ رہے گا۔

ایک اور جگہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے (واصبر لحكم ربك فانك باعيننا) کہ آپ صبر کیجئے۔ آپ تو ہماری نگاہ کے سامنے ہیں۔ یہ عاشقانہ لم اور تدبیر ہے رنج کے دور کرنے کی۔

میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں اس سے اس کی تفسیر سمجھ میں آجائے گی وہ یہ کہ کسی پر ایک شخص عاشق تھا۔ اس کے سو درے مارے گئے (۱)، ننانوے درہ تک آہ بھی منہ سے نہ نکلی، اخیر میں ایک درہ لگا تو منہ سے آہ نکلی کسی نے پوچھا کہ ننانوے تک تو تیرے منہ سے کچھ بھی نہ نکلا اور ایک درہ میں یہ حال ہوا۔ عاشق نے کہا کہ ننانوے درہ تک تو میرا محبوب کھڑا ہوا مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ اس وجہ سے کچھ تکلیف نہیں معلوم ہوئی اور اخیر درہ میں وہ چلا گیا تھا۔ دیکھتا نہ تھا اس لئے آہ نکلی اسی واسطے ایک عاشق کہتا ہے۔

(۱) کوڑے۔

ببینم بس کہ داند ماہ رویم کہ من نیز از خریدا ران اویم

''یہی کافی ہے کہ میرا محبوب جان لے کہ میں اس کے خریداروں میں سے ہوں''

اس کا بڑا خط ہے(۲) کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ بس بڑی تسلی اہل اللہ کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تسلی کا اور کوئی درجہ ہی نہیں۔ اور دنیا میں بھی اس قسم کے سینکڑوں واقعات موجود ہیں کہ محبوب مجازی کے دیکھنے سے تمام تکالیف راحت ہوگئی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اہل اللہ چونکہ حق تعالیٰ میں مشغول ہوتے ہیں اور ہر مصیبت انہی کی طرف سے سمجھتے ہیں اس وجہ سے انہیں کسی بات سے پریشانی نہیں ہوتی اور چونکہ یہ رنگ ان کا مرنے کے وقت بھی موجود رہتا ہے، زائل نہیں ہوتا، اس لئے جیسے زندگی کے واقعات میں انہیں پریشانی نہیں ہوتی اسی طرح مرنے کے وقت بھی پریشانی نہیں آتی۔

موت کی پریشانی

پھر اوپر سے اہل اللہ کو موت کے وقت یہ بشارت بھی دی جاتی ہے ﴿وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ﴾(۱) موت کے وقت کہا جاتا ہے کہ گھبرانا مت۔ بعضے لوگوں نے بیان کیا کہ بعض لوگوں کو طاعون کے زمانے میں مرتے دیکھا کہ وہ اپنے باپ اور استاد کا نام لے رہے تھے کہ وہ کھڑے ہیں اور ہم کو بلا رہے ہیں۔ وہ مانوس شکل میں فرشتے تھے تاکہ یہ گھبرائیں نہیں۔ سو اہل اللہ مرنے کے وقت بھی خوش ہوتے ہیں۔

(۲) لطف ہے (۱) حم سجدہ۔

چنانچہ ایک بزرگ کے مرنے کا وقت قریب تھا اور وہ خوشی میں آ کر کہہ رہے تھے ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سراسر جاں شوم

''اب وہ وقت آ گیا کہ میں عریاں ہو جاؤں جسم کو چھوڑ کر سراسر جان ہو جاؤں''

کیا یہ لوگ بیہودہ تھے جو ایسا کرتے تھے۔ واقع یہ ہے کہ ان کو اس وقت نہایت خوشی کا عالم ہوتا ہے پھر قبر میں دیکھئے ان کے لئے کیا خطاب ہوتا ہے۔ جس وقت منکر نکیر آتے ہیں اور سوال کرتے ہیں اور یہ جواب دیتے ہیں تو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے: ان صدق عبدی ''کہ میرے بندہ نے سچ کہا''

اس کے لئے جنت کی طرف دروازہ کھول دو۔ غرض سب راحت کا سامان کر دیا جاتا ہے۔

پھر قیامت میں دیکھئے جو کہ بڑی گھبراہٹ کا وقت ہے کہ انہیں اس وقت بھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی چنانچہ ارشاد ہے: ﴿لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ﴾ ''کہ ان کو فزاع اکبر بھی گھبراہٹ میں نہ ڈالے گی''

مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو میں نے یہ اشعار پڑھتے ہوئے سنا۔ گویا وہ اس کا ترجمہ ہے۔ فرماتے تھے ؎

عاشقاں را روز محشر با قیامت کار نیست عاشقاں را جز تماشائے جمال یار نیست

رہی دوزخ، سو اس میں اول تو جائیں گے کیوں! وہ تو ان سے الگ رہنا چاہے گی چنانچہ حدیث میں ہے کہ دوزخ کہے گی۔ جزیا مومن فان نورك قد اطفأ ناری (۱) کہ اے مومن جلدی سے گزر جا تیرا نور تو میری آگ کو بجھائے دیتا ہے۔

جب دوزخ خود ان سے پریشان ہوگی تو وہ انہیں کیا جلائے گی۔ یہی اسے ٹھنڈی کر دیں گے پھر ایسے لوگوں کو کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔

میں اہل اللہ کی راحت کا ایک فوری درجہ ادراک بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ اللہ والوں کے پاس دس منٹ کے لئے بیٹھ جائے۔ ان کے پاس بیٹھنے سے آپ کے قلب میں اطمینان ہوجائے گا۔ پس جب پاس بیٹھنے والے کو اطمینان ہوجاتا ہے تو ان کے اطمینان کو کیا پوچھتے ہو۔ بس اللہ کے ساتھ تعلق پیدا کرنا چاہیے جس سے ہر موقع پر اطمینان ہو کہیں بھی پریشانی نہ ہو۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ دیکھی ذکر کی برکت۔

نماز کی برکت

سو یہ تمام برکت نماز کی بھی ہے کیونکہ وہ بھی ذکر ہے اسی واسطے فرماتے ہیں ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾ ''بامراد ہوا جو شخص (خبائث عقائد واخلاق سے) پاک ہوگیا اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔ مگر یہ بات اسی وقت حاصل ہوگی جب کہ نماز کی تکمیل کرے، وقت پر پڑھے، جماعت کے ساتھ ادا کرے، قرآن کی تصحیح کرے، قلب کے متوجہ کرنے کی کوشش کرے اگر متوجہ نہ ہو تو کسی شیخ سے پوچھے۔ اور خود تو کرے ہی دوسروں کو اس کی ترغیب دلائے۔ جو اچھی چیز ہوتی ہے۔ اس کو دوسروں کو بھی بتلاتے ہیں۔ اسی واسطے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وتواصوا بالحق ''اور ایک دوسرے کو (اعتقاد) حق پر قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہے) جہاں توقع ہو راہ پر آنے کی وہاں ضرور کہو مگر نرمی سے کہو دوسرے کو ذلیل مت سمجھو۔ ممکن ہے کہ کوئی چیز اس میں ایسی ہو کہ وہ اس کی وجہ سے ہم سے بڑھ جائے۔ اگر کسی کو سیاست (۱) کرنی پڑے تب بھی حقیر مت سمجھو اگر کوئی کہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ سیاست کی جائے اور اس کو حقیر نہ سمجھا جائے۔

امام غزالی m نے اس کی مثال لکھی ہے۔ وہ یہ کہ کوئی بھنگی بادشاہ کے

(۱) ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑے۔

حکم سے شہزادے کے بید لگائے تو وہ سیاست تو کر رہا ہے مگر شہزادہ کو حقیر نہیں سمجھتا۔ اس کو ویسے ہی معزز مکرم سمجھ رہا ہے مگر بادشاہ کے حکم سے مجبور ہے۔ لہذا سیاست اور حقیر نہ سمجھنا دونوں جمع ہوسکتے ہیں۔ امر بالمعروف اس طرح نہ ہونا چاہیے کہ کسی کو ذرہ برابر حقیر جانو۔ اگر خفگی کی ضرورت ہے تو اس طرح سے خفگی ظاہر کرو جیسے بچہ دوا پینے میں مچلتا ہے اور آپ اس پر غصے ہوتے ہیں۔ غصہ تو ہے مگر جوش محبت کے ساتھ۔ کیا غصہ قطع تعلق کرنے کے ارادہ سے کرتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ چاہتے ہو کہ کسی طرح دوا پی لے۔ جو نماز نہ پڑھے، تو یہ نہیں کہ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دو بلکہ یہ دیکھو کہ کس طرح سے ہمارا بھائی مسلمان نمازی ہوجائے گا۔ بس ویسے ہی کرو۔ نرمی سے سختی سے، کچھ دینے سے غرض جیسے بھی راہ پر آنے کی امید ہو اس طرح کرو۔ البتہ مداہنت نہ ہو سو امر بالمعروف اس طرح ہونا چاہیے اور اس طرح اپنے ساتھ دوسروں کو بھی فلاح میں لاؤ۔ اب میں بیان ختم کرتا ہوں۔

دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق عمل کی مرحمت فرمائیں۔ آمین۔

فقط بفضل اللہ و برحمتہ۔ اشرف علی (۱)

---

(۱) اللہ تعالیٰ ہم سب پڑھنے والوں کو نماز کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے اور نماز کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۲۱/ دسمبر ۲۰۱۳ء